Phone : 7300

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1960ء

کیا طلوع اسلام منکر حدیث ہے

طلوع اسلام یہ کہتا ہے کہ احادیث کی کتابوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی - صحیح اور غلط کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث، قرآن کریم کے خلاف ہے وہ غلط ہے - طلوع اسلام ان حدیثوں کا انکار کرتا ہے جو قرآن کریم کے خلاف ہیں -

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے:- آٹھ روپے
غیر ممالک سے:- ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون۔ ۷۵۰۰
خط وکتابت کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی ——— گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۳	جنوری سنہ ۱۹۶۰ء	نمبر ۱

— فہرست مضامین —

لمعات		۲	۱۱
طلوع اسلام کی آئندہ کنونشن درابطۂ باہمی		۱۲	۱۵
اسلام آگے کیوں نہ چلا؟	(محترم پرویز صاحب)	۱۷	۴۸
سرسید احمد خانؒ	(محترم صفدر سلیمی صاحب)	۴۹	۵۶
باب المراسلات	[۱. ابلیسانی توانائی. ۲. اسلامی اور قرآنی. ۳. جنسی اخلاق]	۵۷	۵۸
اختلافاتِ قراءت	(علامہ تمنا عمادی صاحب)	۵۹	۶۴
قائد اعظم اور اسلامک آئیڈیالوجی	(محترم پرویز صاحب)	۶۵	۷۵
حقائق و عبر		۷۶	۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(برگِ گل)

دنیا کے مختلف ممالک میں جس قدر عسکری انقلابات آئے ہیں، آپ ان پر غور کریں گے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ وہ "آہنی ڈکٹیٹر شپ" کے ہوسِ اقتدار کی تسکین کا ذریعہ تھے۔ جس شخص کے ہاتھ میں قوت آگئی اس نے ملک کو اپنے فولادی پنجہ کی گرفت میں جکڑ لیا۔ لیکن سرزمینِ پاکستان کچھ ایسی خوش قسمت واقع ہوئی ہے کہ اس میں عسکری انقلاب، جمہوریت کے قیام کا پیش خیمہ بن رہا ہے۔ صدر مملکتِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں، جس تیزی سے ملک کو جمہوری نظام کی طرف لے جا رہے ہیں، اس کی مثال کم ملے گی۔ دسمبر کے دوسرے اور تیسرے ہفتہ میں، وہ "پاک جمہوریت" کے کارواں کو جس برق رفتاری سے ملک کے دور دراز گوشوں تک لے کر پھرے ہیں، وہ ان کے عزم راسخ اور عملِ پیہم کی دلیل ہے۔ اس طوفانی دورہ میں انھوں نے مختلف مقامات پر اپنی تقاریر کے دوران میں بعض ایسے اہم نقاط پیش کئے ہیں جن کا پاکستان کے مستقبل کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہم اشاعتِ ردواں کے لمعات کو انہی برگہائے گل و لالہ کے تذکرے کی نذر کرتے ہیں۔

جمہوریت

۷ دسمبر کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے، صدر مملکت نے فرمایا۔

مجھے یقینِ واثق ہے کہ ہمارے لئے جمہوریت نہایت ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان میں کس انداز کی جمہوریت کی ضرورت ہے۔ کیا مغربی انداز کی جمہوریت (جو وہاں کامیابی سے چل رہی ہے) ہمارے لئے موزوں ہوگی؟ میرا خیال ہے کہ ہمارے تجربہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مغربی قالب کی جمہوریت ہمارے ہاں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمارے لئے ایسی جمہوریت کی ضرورت ہے جسے ہم سمجھ سکیں اور کامیابی سے چلا سکیں۔

(پاکستان ٹائمز۔ $\frac{12}{59}$ ۱۸)

جمہوریت کے دو گوشے ہیں۔ ایک ہے جمہوریت کی مشینری۔ اور دوسرا ہے جمہوریت کا مغز۔ مغربی طرزِ جمہوریت کی مشینری ہمارے حالات کے سازگار نہیں اور وہاں کی جمہوریت کا مغز، اسلام کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس لئے وہ ہر لحاظ سے ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک

جمہوریت کی مشینری کا سوال ہے، مغرب اس پر ایک عرصہ سے تجربہ کر رہا ہے۔ وہاں کے عوام میں مقابلۃً سیاسی شعور کی بیداری ہے۔ وہ اپنے نمائندوں کو اچھی طرح سے جانتے اور اپنے ووٹ کی قیمت کو پہچانتے ہیں۔ اس لئے وہاں اگر حلقہ ہائے انتخاب بڑے بڑے وسیع رقبوں پر بھی مشتمل ہوں تو بھی زیادہ نقصان کا موجب نہیں ہوتے۔ لیکن ہمارے ہاں، جہاں عوام ابھی سیاست کی مبادیات تک سے ناآشنا ہیں، عوام کو ایسے لوگوں کے انتخاب کے لئے کہنا جن کی سیرت و کردار کا انھیں کچھ علم نہ ہو محض انتخاب کی رسم پوری کرنا ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظریہ اس اصول کے ماتحت وضع کیا گیا ہے کہ حلقہ ہائے انتخاب چھوٹے چھوٹے ہوں تاکہ عوام اپنے جانے پہچانے لوگوں کو منتخب کر سکیں۔ نیز یہ انتخاب شہری آبادی تک محدود نہ ہو بلکہ ایسے اداروں کو بھی اپنے آغوش میں لے لے جو دیہات کے باشندوں کی زندگی سے متعلق مسائل کا حل سوچنے کے لئے وجود میں آئیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو بنیادی جمہوریتوں کی مشینری، مغربی جمہوریت کی مشینری کے مقابلہ میں ہماری فضا کے لئے زیادہ سازگار ہے۔ اگر لوگوں نے اس سے صحیح فائدہ اٹھایا اور موزوں افراد کا انتخاب کیا تو اس کے نتائج کے شاندار ہونے کی بڑی توقع ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

بنیادی جمہوریتوں کے سلسلہ میں ہمیں دو باتیں کھٹکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ پارلیمان کی رکنیت کے لئے انتخاب، بنیادی جمہوریتوں کے آٹھ ہزار ارکان تک محدود نہ ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی رائے دہندگی کے لئے محض بالغ ہونے (ADULT FRANCHISE) کو کافی نہ سمجھ لیا جائے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب ۱۹۵۶ء کا آئین پاکستان زیر تدوین تھا تو ہم نے تجویز کیا تھا کہ رائے دہندگان اور امیدوار، دونوں کے لئے تعلیم یافتہ ہونے کی شرط لازمی قرار دی جائے۔ بنیادی جمہوریتوں میں تعلیم کی شرط نہیں رکھی گئی۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہ جمہوریتیں دیہات سے شروع ہوتی ہیں اور ان کا دائرہ عمل روزمرہ کے معاملات تک محدود ہے۔ لیکن اگر پارلیمان کا انتخاب بھی انہی ارکان کے دائرہ تک محدود کر دیا جائے۔ یا اس انتخاب کے لئے رائے دہندگی کے لئے شرط صرف بلوغت کو رکھا جائے تو پارلیمان اسی قسم کی مرتب ہوگی جیسی ہماری سابقہ حکومتوں کے زمانہ میں ترتیب پاتی رہی ہے۔ مقام اطمینان ہے کہ صدر مملکت نے ان دونوں امور کے متعلق وضاحت کر دی ہے۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ

> پارلیمان کا انتخاب بنیادی جمہوریتوں کے آٹھ ہزار ارکان تک محدود نہیں ہوگا بلکہ ہر رائے دہندہ پارلیمان کی رکنیت کے لئے کھڑا ہو سکے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ انتخاب محض بالغان کی آراء سے نہیں ہوگا بلکہ امیدواروں کو وہ لوگ منتخب کریں گے جو روشن خیال اور باشعور ہوں گے۔
>
> (پاکستان ٹائمز ۱۸ ۱۲/۵۹)

اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ پارلیمان کا الیکشن براہ راست نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں تو انھوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ اگر کانسٹی ٹیوشن کمیشن بھی براہ راست الیکشن کی سفارش کرے گا تو کابینہ اسے منظور نہیں کرے گی۔ (ایضاً)

یہاں تک "جمہوریت کی مشینری" کے متعلق بات تھی (اور ظاہر ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جن اقدام کا اظہار صدر مملکت نے کیا ہے، وہ مغربی جمہوریت کی مشینری سے بہرحال بہتر اور ہمارے حالات سے زیادہ سازگار ہے)۔ اب مغز جمہوریت کا سوال سامنے

آتا ہے۔ اور یہی بنیادی سوال ہے۔ مغربی جمہوریت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ مملکت میں "اقتدارِ اعلیٰ" (SOVEREIGNTY) عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں اور جو فیصلہ عوام کے نمائندگان کی اکثریت کرے وہ ملک کا قانون قرار پا جاتا ہے۔ جس کی اطاعت ہر ایک کے لئے لازمی ہوتی ہے۔ "اقتدارِ اعلیٰ" کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اختیارات سے بالا کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ جو چاہے فیصلہ کرے اور جس قسم کا چاہے قانون وضع کر لے۔

مغربی جمہوریت

یہ تصور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے اس قسم کا اقتدارِ اعلیٰ کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے، کچھ بنیادی اصول اور مستقل اقدار عطا کی ہیں جو قرآن میں محفوظ ہیں۔ ان اصول و اقدار میں کوئی فرد۔ کوئی ادارہ۔ کوئی حکومت۔ کوئی مملکت۔ کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔ مملکتِ اسلامیہ ان اصول و اقدار کو برقرار رکھنے اور انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس مملکت کو البتہ اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے لئے جزئی قوانین مرتب کر لے۔ یہ قوانین امت کے باہمی مشورے سے مرتب کئے جاتے ہیں ——— باہمی مشاورت کا اصول بھی قرآن کا مقرر کردہ اور غیر متبدل ہے ——— اس مشاورت کے لئے جو مشینری بھی مناسب اور موزوں ہو، وضع کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اسلامی جمہوریت کے معنی ہیں

قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے حالات کے مطابق، امت کے مشورہ سے، جزئی قوانین مرتب کرنا۔

یہ اصول، غیر متبدل رہیں گے اور ان کی حدود کے اندر وضع کردہ قوانین باہمی مشاورت سے تبدیل ہوتے رہیں گے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگرچہ جمہوریت کی مشینری بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے لیکن اصل سوال "مغز جمہوریت" کا ہے اگر یہ اسلامی ہے تو جمہوریت کی مشینری بھی اسلامی ہو جائے گی (اس لئے کہ وہ ایک اسلامی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوگی) لیکن اگر مغز جمہوریت غیر اسلامی (یا سیکولر) ہے تو جمہوریت کی مشینری بھی غیر اسلامی قرار پائے گی۔

یہ امر بھی موجبِ اطمینان ہے کہ محترم صدر مملکت نے گذشتہ تیرہ چودہ ماہ کے عرصہ میں، مختلف مقامات پر اپنے اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ پاکستان کا آئندہ دستور، اسلامی خطوط پر تشکیل ہوگا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے فرمایا۔

دستورِ پاکستان

اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے طریق، زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ (ڈان ۱۸/۱۲/۵۹، پاکستان ٹائمز ۱۷/۱۲/۵۹)

اس ضمن میں انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس مقصد کے لئے باہر سے لوگ نہیں بلائے جائیں گے۔ (ایضاً)

دوسرے مقام پر انہوں نے اس کا اعادہ ان الفاظ میں فرمایا کہ

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن (یہ سمجھ

لینا چاہیئے کہ اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات تفصیلات اور طریقے حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

(پاکستان ٹائمز ۱۲/۵۹ ۱۸)

گجرات میں انھوں نے کہا۔

پاکستان ایک آئیڈیالوجی کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔ اور وہ آئیڈیالوجی اسلامک ہے۔ اس لئے اس میں شبہ کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہوگا۔ آئین کمیشن ان حضرات پر مشتمل ہوگا جنھیں اسلام کی بھی پوری پوری واقفیت ہو اور جو علوم حاضرہ سے بھی باخبر ہوں اس لئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک کو تیرہ چودہ سو سال پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اگر کمیشن کی سفارشات اس معیار پر پوری نہ اتریں تو کابینہ انھیں کبھی منظور نہیں کرے گی۔ اور اگر بفرض محال کابینہ بھی انھیں منظور کرلے اور پارلیمان دیکھے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں تو وہ دو تہائی کی اکثریت سے ان میں تغیر و تبدل کرسکے گی۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲/۵۹ ۲۱)

محترم صدر مملکت کے یہ خیالات اسلام کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں اور اس کے لئے ہم انھیں مستحق ہزار مبارکباد سمجھتے ہیں۔ جب ہمارا آئندہ دستور ان اصولوں کے مطابق مرتب ہوگیا تو اُس وقت ہماری مملکت بھی اسلامی ہونے کا دعوےٰ کرسکیگی اور جمہوریت کی مشینری کے سلسلہ میں جو اُن تھک کوششیں اس وقت ہو رہی ہیں وہ بھی اسلامی قرار پاجائیں گی۔ یوں تو صدر مملکت کی ہر مخلصانہ کوشش ان کا نام بلند کرنے کا موجب ہوگی لیکن اگر ان کی سربراہی میں مملکت کا آئین قرآن کے مطابق مرتب ہوگیا تو اس سے جریدۂ عالم پر ان کا نقش دوام ثبت ہوجائے گا اور ان پر دنیا اور آخرت میں خدا کے ان انعامات کی بارش ہوگی جن کی مثال کہیں نہیں مل سکیگی۔

کتنی بڑی خوش بختی ہے اُس فرزند توحید کی جسے مبدأ فیض کی طرف سے ایسا مقام بلند عطا ہوجائے۔ ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشآء۔

سیاسی پارٹیاں

جیکب آباد میں تقریر کرتے ہوئے صدر مملکت نے کہا کہ ملک کو جمہوری نظام کی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں سیاسی پارٹیاں نہیں ہونی چاہئیں۔

(ڈان۔ ۱۲/۵۹ ۱۷)

یہ خیال بھی کس قدر عین قرآنی ہے۔ قرآن کی رُو سے اُمت میں اختلاف اور تفرقہ، خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں، خدا کا عذاب اور شرک ہے۔ اسلامی مملکت میں ان کا وجود نہیں رہ سکتا۔ موجودہ عسکری قانون کی ایک برکت یہ بھی ہے کہ اس نے سیاسی پارٹیوں کو ختم کردیا۔ اب صدر مملکت کے اعلان سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان پارٹیوں کو دوبارہ زندہ نہیں ہونے دیا

جائے گا۔ صدر مملکت نے یہ بھی کہا ہے کہ پارٹی سسٹم کی حکومت ملک کو کمزور کرے گی اس لئے ہمارے ہاں اس کی بھی ضرورت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اسلام میں مختلف پارٹیوں کے وجود ہی کی گنجائش نہیں تو اسلامی حکومت میں "پارٹی سسٹم" کس طرح بار پا سکتا ہے؟ نہ اس کی مجلسِ مشاورت (پارلیمان) میں کوئی پارٹی ہوگی۔ نہ حکومت پارٹی سسٹم پر چلے گی۔ اسلامی نظام زندگی میں تو دو پارٹیاں دو ہی ہو سکتی ہیں۔ ایک "محمد رسول اللہ کی پارٹی" اور دوسرے (اس کے مقابلہ میں) ابوجہل کی پارٹی۔ محمد رسول اللہ کی پارٹی (یعنی امتِ مسلمہ) کے اندر پارٹیوں کا وجود قرآن کی نصِ صریح کی رُو سے شرک ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ امت کے نمائندے ہر معاملۂ زیرِ بحث کے متعلق اپنی اپنی آراء کا اظہار کریں گے۔ ان کی آراء میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف ہم آراء افراد مزید غور و فکر کے لئے اپنا ایک الگ گروپ بھی بنا لیں۔ لیکن اس مسئلہ کے تصفیہ کے بعد اختلافِ آراء و خیال کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی گروپ بھی ٹوٹ جائیں گے۔ یہ ان پارٹیوں کی شکل میں مستقل طور پر موجود نہیں رہیں گے جن کا فریضہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر معاملہ میں دوسری پارٹی کی مخالفت کی جائے۔ نیز چونکہ وہ تمام امور جو زیرِ بحث آئیں گے محض جزئی اور فروعی ہوں گے۔ اور جہاں تک اصول کا تعلق ہے ان میں تمام نمائندے متفق ہوں گے (کیونکہ وہ اصول قرآنی ہوں گے) اس لئے افراد کی آراء کا اختلاف کسی اصول پر اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔

پارٹیوں کی لعنت کو ختم کرنے کے بارے میں صدرِ مملکت کا احساس اس قدر شدید ہے کہ انھوں نے گجرات میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ ہندوستان کے سوشلسٹ لیڈر مسٹر جے پرکاش نارائن نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جو شخص پارٹیوں کے وجود کو ختم کر دے گا اس پر خدا کی رحمت ہوگی۔ اس کے بعد صدر مملکت نے کہا کہ

> میں مسٹر جے پرکاش نارائن سے متفق ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کا علاج کیا ہے۔ پارٹیوں کے وجود کو ختم کیسے کیا جائے۔ اگر کوئی صاحب اس باب میں مجھے مشورہ دیں تو میں ان کا شکر گذار ہوں گا۔
>
> (ڈان۔ $\frac{۱۳}{۵۹}$ ۲۱)

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ملک کا آئین قرآنی خطوط پر مرتب ہو جائے اور طرزِ حکومت پارلیمانی کے بجائے صدارتی (PRESIDENTIAL) ہو تو پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ اس باب میں ہم اپنی معروضات بالوضاحت آئندہ شمارہ میں پیش کریں گے۔

مذہبی فرقے

جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا مٹانا ناممکن ہے۔ یہ غلط ہے۔ فرقے بھی مٹائے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لئے وقت درکار ہوگا ــــ تپِ دق کا علاج ایک دن میں نہیں ہو سکتا ــــ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک طرف "فرقے پیدا کرنے والے" کارخانوں کو بند کر دیا جائے ــــ یعنی مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں کو ختم کر دیا جائے۔ اور موجودہ مولوی صاحبان کی باعزت روزی کا انتظام کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف تعلیم اس انداز سے دی جائے جس سے اسلام کے اصول نہایت درخشندہ اور تابناک طور پر سامنے آجائیں لیکن فرقہ بندی کی کوئی بات ذہن میں نہ آئے

پائے۔ مقامِ مسرت ہے کہ صدرِ مملکت کی نگاہ کا رخ بھی اسی سمت کو ہے چنانچہ انھوں نے حبیب آباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

حکومت ثانوی درجہ تک جبری دینی تعلیم کی اسکیم نافذ کرے گی۔ لیکن یہ تعلیم اسلامی اصولوں پر مشتمل ہوگی۔ عقاید سے متعلق نہیں ہوگی۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲/۵۹ ۱۷)

مساجد

قارئین کو یاد ہوگا کہ حال ہی میں، طلوعِ اسلام نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں اپنی مساجد میں اسکول کھول دینے چاہئیں اور ائمہ مساجد سے معلموں کا کام لینا چاہیئے۔ صدرِ مملکت نے ملتان میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ

حکومت اس تجویز پر غور کر رہی ہے کہ دیہات کی مساجد کو پرائمری اسکولوں کے لئے استعمال کیا جائے اور ائمہ مساجد کو ان اسکولوں میں ٹیچر مقرر کر دیا جائے۔ اس میں دشواری یہ ہے کہ تمام ائمہ مساجد پرائمری تک تعلیم دینے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ بنیادی جمہوریتوں کا ایک فریضہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایسے امام مقرر کریں جو بچوں کو ابتدائی تعلیم دے سکیں۔ (ڈان ۱۲/۵۹ ۱۸)

اس وقت تو اماموں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نماز پڑھاتے ہیں اور پھر گھر گھر سے روٹیاں مانگتے پھرتے ہیں۔ ایسے ائمہ سے آپ یہ توقع کس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ ملت کے تعمیری کاموں میں کوئی حصہ لے سکیں گے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲/۵۹ ۲۲)

کمیونزم کی روک تھام

صدرِ مملکت نے ایک سوال کے جواب میں یہ بھی فرمایا کہ کمیونزم کے خطرہ کی روک تھام کے لئے، اسلامی آئیڈیالوجی کی عام نشر و اشاعت کی اشد ضرورت ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲/۵۹ ۱۶) اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت دنیا میں کمیونزم کا کماحقہٗ مقابلہ قرآنی نظام ہی کر سکتا ہے اور اس کے لئے اس نظام کی عام اشاعت کی بڑی ضرورت ہے۔ لیکن کمیونزم کی روک تھام صرف اسی صورت میں ہو سکے گی جب قرآنی نظامِ ربوبیت عملاً نافذ ہو جائے۔ اس نظام کی رو سے مملکت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے گی۔ لہٰذا سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہمارے آئندہ دستور میں یہ بنیادی شق شامل کی جائے کہ افرادِ مملکت (اور ان کی اولاد) کے رزق کی ذمہ داری، مملکت کے سر پر ہوگی۔ اور اس کے بعد عملاً ایسی تدابیر رفتہ رفتہ اختیار کی جائیں جن سے مملکت اپنی اس اہم اور بنیادی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔ یہی وہ بند ہے جس سے کمیونزم کا سیلاب ٹکرا سکتا ہے ـــــ نہ صرف یہ کہ اس سے کمیونزم کا سیلاب رک سکتا ہے بلکہ یہ پاکستان کو اقوامِ عالم کی امامت (لیڈر شپ) کا مستحق بھی بنا سکتا ہے ـــــ طلوعِ اسلام اسی نظام کا علمبردار اور اس کے فلسفہ کا نقیب ہے۔

بہاولپور میں ایک سوال کے جواب میں، صدرِ مملکت نے کہا کہ

مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں ایک ہزار میل کا بُعد ہے لیکن (اس کے باوجود) مذہب کی

قوت وہ رشتہ ہے جس نے ان دونوں کو باہمدگر منسلک کر رکھا ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۳/۵۹-۱۸)

اس مختصر سے فقرہ میں صدر مملکت نے اسلام کے ایک بنیادی اصول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کی رُو سے، قومیت کا معیار

قومیت کا معیار

دین کا اشتراک ہے۔ وطن کی جغرافیائی حدود نہیں۔ یہی وہ بنیادی اصول تھا جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور اسی اصول کے مطابق اس مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا۔ تحریک پاکستان کے مخالفین کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان کی حدود کے اندر بسنے والے مختلف مذاہب کے پیرو ایک قوم کے افراد ہیں؛ لیکن مدعیانِ مطالبۂ پاکستان کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اپنے جداگانہ مذہب (دین) کی بنا پر ایک جداگانہ قوم ہیں اس لئے ان کی مملکت بھی ہندوؤں سے الگ ہونی چاہیئے۔ قریب دس برس کی کشمکش کے بعد اس نظریۂ قومیت کو کامیابی ہوئی اور پاکستان وجود میں آگیا۔ اس طرح مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مسلمان ایک قوم کے افراد تسلیم کئے گئے۔ یہی وہ محکم رشتہ ہے جس کی بنا پر اس قدر بُعدِ مسافت کے باوجود، ان دونوں خطوں کے مسلمان ایک وحدت کے اجزائے لاینفک ہیں۔

"متحدہ قومیت" کے نظریہ کے حامیوں نے تشکیل پاکستان کے بعد، یہاں وقتاً فوقتاً اس سوال کے اٹھانے کی کوشش کی کہ پاکستان کے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد ہیں اور ان کا انتخاب مخلوط ہونا چاہیئے لیکن ان کی بات آگے نہ چل سکی۔ چل کیسے سکتی؟ اس سے تو پاکستان کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے اور قومیت کے متعلق اسلام کے اصول کی کھلی ہوئی تردید ہوجاتی ہے۔ سنہ ۱۹۵۶ء کے دستور پاکستان کی ایک غیر اسلامی شق یہ بھی تھی کہ اس کی رُو سے غیر مسلم پاکستانی

غیر مسلم پاکستانی

مجالس قوانین ساز کے ارکان ہو سکتے تھے اور ان مجالس کی کاروائیوں میں مسلمانوں کے دوش بدوش شرکت کر سکتے تھے۔ یہ چیز، خلافِ اسلام ہونے کے علاوہ جس قدر مضحکہ خیز تھی، اسکی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اسلامی مملکت کی مجلسِ قوانین ساز کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآنی اصولوں کی حدود کے اندر مملکت کے تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (یعنی غیر مسلم) قرآنی اصولوں کی صداقت ہی کے قائل نہ ہوں، انھیں ان اصولوں کے مطابق قوانین سازی کے کام میں شریک کرنا، قرآنی اصولوں کا مضحکہ اڑانا اور خود ان لوگوں کا منہ چڑانا ہے جو ان اصولوں کو مانتے نہیں۔ غنیمت ہے کہ وہ "دفتر بے معنی غرقِ مے ناب" ہوگیا۔ اب اگر ہمارے آئندہ آئین نے اسلامی بننا ہے تو اس میں یقیناً اس قسم کی بیہودہ شقیں نہیں ہونگی۔

مخلوط انتخاب

بعض حلقوں میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بنیادی جمہوریتوں میں طریقِ انتخاب بھی مخلوط رکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک اصول کا تعلق ہے یہ چیز صحیح نہیں۔ لیکن چونکہ ان اداروں کا حلقۂ عمل محض نچلی قسم کے معاملات تک محدود ہوگا اس لئے ایک حد تک یہ امر چنداں مضرت رساں نہیں ہو سکتا۔ اس کا گہرا اثر وہاں جا کر پڑتا ہے جہاں ان ارکان کے سپرد قانون سازی کا کام کیا جائے یا انھیں اصولی معاملات میں دراندازی کا موقع مل سکے۔ ہمیں امید ہے کہ زیر تجویز کانسٹی ٹیوشن کمیشن اس مسئلہ کو کما حقہٗ اہمیت دیگا اور اپنی سفارشات میں اس امر کی وضاحت کر دے گا کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی پر مبنی ہے اس لئے جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ ان لوگوں کے ساتھ اصولی امور میں کس طرح شرکت کر سکتے ہیں

جو اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے باقی تمام متعلقہ امور خود بخود صاف ہو جائیں گے۔ اس کے بعد بنیادی جمہوریتوں کے ابتدائی اداروں میں بھی طریق انتخاب مخلوط نہیں ہوگا۔

واضح رہے کہ جداگانہ انتخاب یا غیر مسلموں کے مجالس قوانین ساز میں شرکت کے جائز نہ ہونے سے نہ ان کی کسی قسم کی توہین مقصود ہوتی ہے۔ نہ انہیں ان کے کسی جائز حق سے محروم کیا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے واجب التکریم ہے۔ یہی وہ بنیادی قدر ہے جس کی طرف صدر مملکت نے اپنی ایک تقریر میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ

تکریم انسانیت

> ہم ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر شخص کو وہ عزت اور آزادی حاصل ہو جس کا وہ حقدار ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲/۵۹ ۲۰)

لیکن اس عزت اور آزادی کے معنی یہ نہیں کہ کوئی شخص جس منصب کا خود اہل نہ بننا چاہے اسے وہ منصب عطا کر دیا جائے۔ اسلامی نظام ایک مخصوص آئیڈیالوجی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی کو اختیار کرے یا اس سے انکار کر دے۔ اب جو شخص برضا و رغبت اس آئیڈیالوجی سے انکار کر دے، اس کے سپرد وہ کام کس طرح کئے جا سکتے ہیں جو اس آئیڈیالوجی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں؟ یہ کام تو لامحالہ انہی کے سپرد کئے جا سکتے ہیں جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح مانتے ہوں۔

افراد کے بجائے نظام

صدر مملکت نے اپنی تقاریر میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا کہ انہیں افراد کے بجائے نظام پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا کہ

> کسی ایک فرد پر بھروسہ کر لینا خطرناک ہوتا ہے۔ آپ اس وقت مجھ سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر کل کو (خدانخواستہ) مجھے کچھ ہو گیا تو وہ مشینری (نظام) کہاں ہے جو ہمیں اس کی ضمانت دے سکے کہ میرا جانشین، قاعدے اور قانون کے مطابق میرا جانشین بنے گا اور کوئی فتنہ برپا نہیں ہو جائیگا۔
>
> (ڈان ۱۲/۵۹ ۱۷)

یہ اصول دنیا کو سب سے پہلے قرآن نے دیا تھا کہ افراد کی بجائے، نظام اور آئین پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ حقیقت ہے کہ خود ختم نبوت کا اعلان اسی انقلاب عظیم کا مظہر تھا کہ اب زمانہ اشخاص کے بجائے قانون اور نظام کا آرہا ہے۔ ہماری ملوکیت اور پیشوائیت نے اس قرآنی انقلاب کو پس پشت ڈال کر پھر سے اشخاص پرستی کو عام کر دیا۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ پاکستان میں ایسی فضا پیدا ہو رہی ہے جس میں قرآنی انقلاب کے بروئے کار آنے کے امکانات بہت قوی نظر آرہے ہیں۔ کس قدر مسرتوں کی نوید لائے گا وہ دن جب یہاں قرآنی آئین و نظام نافذ ہوگا اور مملکت کا ہر چھوٹا بڑا صرف احکام خداوندی کے سامنے جھکے گا۔ یہ وہ دن ہوگا

جب صدر مملکت کے الفاظ میں

حاکم اور محکوم کا فرق مٹ جائے گا۔ (پاکستان ٹائمز ۱۹ ۱۲/۵۹)

اُس دن

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پا
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

پیشۂ وکالت

شیخوپورہ کے ایک وکیل کے سوال کے جواب میں صدر مملکت نے کہا کہ

جب تک ملک میں وکیلوں اور صحافیوں کی بھرمار ہے۔ حقیقی امن نصیب نہیں ہو سکتا۔

(پاکستان ٹائمز ۲۰ ۱۲/۵۹)

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے لا کمیشن کے سوالنامے کے جواب میں کہا تھا کہ ملک کے نظام عدل سے وکالت کا ادارہ (INSTITUTION) ختم کر دینا چاہیئے اور ان کی جگہ حکومت کی طرف سے ایسے قانون دان افراد (بطور عمال حکومت) مقرر ہونے چاہئیں جو لوگوں کو (بلا معاوضہ) بتائیں کہ ان کے متنازعہ فیہ معاملہ میں قانونی پوزیشن کیا ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا، ملک موجودہ تباہی سے بچ نہیں سکتا۔

بعض حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ صدر مملکت نے اپنی مختلف تقاریر میں، ملک کے آئندہ آئینی ڈھانچے کے متعلق بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کا فیصلہ درحقیقت مجوزہ آئین کمیشن کی سفارشات کے بعد ہونا چاہیئے۔ مثلاً ملک کا اندازِ حکومت وحدانی ہونا چاہیئے۔ پارلیمان کا انتخاب بالواسطہ ہونا چاہیئے۔ طرزِ حکومت پارلیمانی کے بجائے صدارتی ہونا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ایسا کہتے وقت یہ حضرات اس اہم نقطہ کو فراموش کر جاتے ہیں کہ صدر مملکت نے اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ یہ

ذاتی خیالات

ان کے ذاتی خیالات ہیں۔ یعنی ایسا کچھ "صدر مملکت پاکستان" نہیں کہہ رہا۔ "فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں" کہہ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے حیدرآباد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

ذاتی طور پر ان کا خیال ہے کہ پارلیمان کا انتخاب بالواسطہ ہونا چاہیئے اور اندازِ حکومت وحدانی۔

(ڈان۔ ۱۶ ۱۲/۵۹)

اس پوزیشن بالکل واضح ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض رپورٹوں میں یہ بھی آیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ اگر آئین کمیشن اس کے خلاف کوئی سفارش کرے گا تو ہم اسے مسترد کر دیں گے۔ لیکن اس "ہم" سے مراد وہ اتھارٹی ہے جسے کمیشن کی سفارشات پر فیصلہ دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔ کمیشن بہرحال سفارشات ہی کرے گا۔ ان سفارشات کے رد و قبول کے لئے کوئی اتھارٹی ہوگی ـــــ خواہ وہ کابینہ ہو یا صدر مملکت ـــــ آخری فیصلہ اس اتھارٹی کا ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی، صدر مملکت نے یہ بھی تو کہہ دیا ہے کہ آئین کے ماتحت مرتب ہونے والی پارلیمان کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ (دو تہائی اکثریت سے) آئین میں مناسب ردوبدل کر سکے۔ (ڈان ۔ ۱۲/۵۹ ۔ ۱۷)۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آخری اختیار کسی فرد کو نہیں، نظام ہی کو حاصل ہوگا۔

لیکن یہ نقطہ کبھی نظر انداز نہ ہونے دینا چاہیئے کہ تغیر و تبدل کا اختیار — خواہ وہ کسی فرد کو ہو یا افراد کے مجموعہ کو — صرف جزئیات میں ہوگا۔ جہاں تک قرآنی اصولوں کا تعلق ہے ان میں دو تہائی اکثریت تو ایک طرف، سو فیصدی اکثریت بھی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی مجاز نہ ہوگی۔

یہ ہیں وہ خیالات جن کا اظہار صدر مملکت نے اپنے حالیہ دورہ میں مختلف مقامات پر کیا۔ ان خیالات سے واضح ہے کہ وہ یہاں

(۱) آمریت کے بجائے جمہوری (مشاورتی) نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) ان کی انتہائی آرزو ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں کا آئینہ دار ہو جن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ملت باہمی مشورے سے اپنے حالات کے مطابق، جزئی قوانین مرتب کرے۔

(۳) وہ ملک کو رجعت پسند اور قدامت پرست طبقہ کے ہاتھوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔

(۴) وہ ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر فرد کو وہ عزت اور آزادی حاصل ہو جس کا وہ مستحق ہے جس میں حاکم اور محکوم میں کوئی امتیاز نہ رہے جو کمیونزم کے سیلاب کی روک تھام کر سکے جس میں نہ سیاسی پارٹیاں ہوں نہ مذہبی فرقے۔ اور جو اسلام کو ایک ترقی پسند ذی قوت تحریک کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نظام، قرآن کے علاوہ اور کہاں سے مل سکتا ہے؟

مستحق صد مبارکباد ہے وہ انسان جس کے خیالات ایسے بلند اور جس کی آرزوئیں ایسی پاکیزہ ہوں۔ اور در خور ہزار تبریک و تہنیت ہے وہ ملک جس کی سربراہی ایسے خیالات کے حامل انسان کے ہاتھ میں ہو۔

خدا کرے کہ صدر مملکت کے یہ خیالات، جلد از جلد عملی پیکر اختیار کر لیں اور ان کی یہ آرزوئیں، محسوس قالب میں سامنے آجائیں تاکہ ہم دنیا سے فخر و مسرت سے کہہ سکیں کہ

دیدۂ آغازم و انجام نگر!

اِسلام آگے کیوں نہ چلا؟

پرویز صاحب کے اس اہم خطبہ کا الگ پمفلٹ شائع کیا گیا ہے جس کی قیمت ۸ آنے ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی ضرورت ہے۔ پمفلٹ مکتبہ طلوعِ اسلام۔ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے مل سکے گا بزموں کو ان کی مستقل فرمائش کے مطابق الگ بھیج دیا جائے گا۔

طلوعِ اسلام کی آئندہ کنونشن

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز!

طلوع اسلام کی چوتھی سالانہ کنونشن کے انعقاد کے دن قریب آرہے ہیں۔ اس ضمن میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ

(۱) آئندہ کنونشن ۸، ۹، ۱۰ اپریل ۱۹۶۰ء۔ بروز جمعہ۔ ہفتہ۔ اتوار حسب سابق۔ بہترین کنونشن ہاؤس۔ شالامار ٹاؤن۔ لاہور میں منعقد کی جائے۔ جمعرات ۷ اپریل کی شب کو تعارفی اجلاس ہوگا۔ اور اتوار بعد دوپہر رخصت۔ مدعوئین کو جمعرات کی شام تک تشریف لے آنا چاہیئے۔

(۲) کھانے اور رہائش کا انتظام صرف نمائندگان کے لئے ہوگا۔ مبصرین کے لئے نہیں ہوگا۔ وہ کنونشن کے کیمپ میں قیام نہیں کرینگے۔ صرف کھلے اجلاس میں، سامعین کی حیثیت سے شریک ہوسکیں گے۔ یہ شرکت بھی بذریعہ دعوت نامہ ہوگی جسے کنونشن کے دفتر سے حاصل کیا جاسکے گا۔

(۳) ایک بزم جس قدر نمائندے چاہے کنونشن میں بھیج سکتی ہے۔ چونکہ کنونشن میں بڑے اہم امور زیر بحث آئیں گے اس لئے ضرورت ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ نمائندگان شریک ہوں۔ (نمائندہ کے لئے بزم کا رکن ہونا ضروری ہے)۔

(۴) اس مرتبہ کھانے کے ساتھ چائے اور مشروبات کا انتظام نہیں ہوگا۔ اس کے لئے پنڈال سے ملحق دوکان کھول دی جائے گی تاکہ ضرورت مند احباب وہاں سے یہ چیزیں قیمتاً لے سکیں۔

اگر کوئی بزم یا اس کے بعض ارکان اپنے زیر انتظام یہ دوکان کھولنا چاہیں تو وہ راقم الحروف سے بات طے کرلیں۔

(۵) تمام مہمانوں سے خوراک اور رہائش کے لئے دس روپیہ بطور تعاون لیا جائے گا۔ یہ رقم ـــــ ۱۵ مارچ تک ـــــ

ناظم صاحب ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

کے نام پہنچ جانی چاہیئے۔ منی آرڈر کے کوپن پر اس کی تصریح کردینی چاہیئے۔ اور اسے کسی دوسرے حساب میں مخلوط نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی صاحب، روپیہ بھیجنے کے بعد کسی وجہ سے کنونشن میں نہ آنا چاہیں تو ان کا روپیہ واپس کردیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ اس کی اطلاع ۱۳ مارچ تک "صدر کنونشن کمیٹی" کو کردیں۔ اطلاع اگر اس کے بعد موصول ہوئی تو پھر رقم واپس نہیں کی جائے گی۔

(۶) کنونشن کے انتظام کے لئے رضا کاروں کی ضرورت واضح ہے۔ اس خدمت کو صرف بزم لاہور تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے بلکہ دوسری بزموں کو بھی اس میں حصہ لینا چاہیئے۔ لہٰذا ہر بزم اپنی طرف سے کم از کم ایک نمائندہ بطور رضا کار تجویز کر دے۔ ان میں سے انتخاب کر لیا جائے گا۔

(۷) کنونشن کے سلسلہ میں جملہ خط و کتابت ذیل کے پتہ پر کی جائے۔

صدر کنونشن کمیٹی۔ معرفت بزم طلوع اسلام
شاہ عالم مارکیٹ۔ جاوید مینشن۔ کمرہ ۱۵۔ (تیسری منزل) لاہور

(۸) جن احباب یا بزموں نے کنونشن کے لئے برتن وغیرہ کی خرید کے سلسلہ میں عطیات کے وعدے کئے تھے اور وہ ابھی تک ایفا نہیں ہوئے۔ وہ براہِ کرم اپنی موعودہ رقوم جلد از جلد ارسال فرما دیں تاکہ ضروری انتظامات میں رکاوٹ پیش نہ آئے۔

باقی آئندہ۔ والسلام

(چوہدری) عبدالرحمٰن
صدر کنونشن کمیٹی۔ لاہور

رپورٹیں

لاہور بزم نے شاہ عالم مارکیٹ میں اپنا نیا دفتر قائم کیا ہے۔ ۱۰ دسمبر کی شام کو اس دفتر میں بزم کا دوسرا اجلاس ہوا اور دفتری نظم و نسق، اشاعت قرآنی اور مالیات سے متعلقہ امور زیر بحث آئے۔ اجلاسہائے ضروری و ہنگامی کے علاوہ ہر ماہ بزم کے دو باضابطہ اجلاس ہوا کریں گے جن کی تاریخوں کا اعلان پہلے سے طلوع اسلام میں کر دیا جایا کرے گا۔ جمعہ، اتوار (اور دیگر قومی تعطیلات) کے سوا دفتر روزانہ ۵½ بجے شام سے ۸ بجے شب تک کھلا رہیگا۔ باہر کے احباب قیام لاہور کے دوران میں مذکورہ اوقات پر دفتر سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

دفتر کا پتہ۔ ۱۳۔ بی۔ شاہ عالمی مارکیٹ۔ (تیسری منزل) بالمقابل کمرشیل کالج۔

پشاور مقام محمدی کے موضوع پر بزم مردان نے پرویز صاحب کی جس تقریر کو ٹیپ ریکارڈ کیا تھا اسے یہاں مختلف اجتماعات میں سنایا جا رہا ہے اور وہ بیحد پسند کی گئی ہے۔ بزم اپنا ریکارڈ جلد از جلد خریدنے کے سلسلہ میں کوشاں ہے۔ مفہوم القرآن اور لغت القرآن کی طباعت کے سلسلہ میں بزم کی طرف سے موعودہ رقم کی پہلی قسط ارسال کی جا چکی ہے بقیہ رقم کی فراہمی کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ڈیرہ غازی خاں۔ چار ماہ کے مسلسل جمود اور سکوت کے بعد اراکین بزم نے از سر نو سرگرم عمل ہونے کا حلف اٹھایا ہے۔ اور یہ محترم

ڈاکٹر محمد حیات ملک کی تشریف فرمائی اور ماسٹر کریم بخش صاحب کی ساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ ہر اتوار کی شام کو درس قرآن کی مجلس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ طلوع اسلام کی اشاعت کے لئے اراکین بزم کو متوجہ کیا گیا ہے چنانچہ میاں عطاء اللہ صاحب نے دو نئے خریداروں کا اضافہ کیا ہے۔ آئندہ اتوار کے اجلاس میں چوہدری غلام محی الدین صاحب کا یہ مجوزہ موضوع زیر بحث لایا جائے گا کہ بزم کی مساعی کو کیونکر مقبول عام بنایا جائے۔ بزم نے محترم میاں ظہور احمد خان صاحب نمائندہ بزم جام پور کے والد مرحوم کی وفات پر اظہار تعزیت کیا اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔

گوجرانوالہ

بزم کے دو اجتماعات ہوئے۔ اراکین بزم پر اصولی ہدایات برائے نظم و ضبط طلوع اسلام کے مسلک و مقصد اور مولوی حضرات کی وجہ مخالفت کی وضاحت کی گئی۔ فرقہ بندی اور غیر قرآنی مذاہب سے اجتناب پر زور دیا گیا اور طلباء اور تعلیم یافتہ اصحاب سے رابطہ قائم کرنے کی اہمیت واضح کی گئی۔ مقامی کالج کے ایک معزز پروفیسر صاحب نے باضابطہ بزم کی رکنیت قبول کر لی ہے۔ ہماری بزم کے ایک شریک کار اور بی اے کے طالب علم نے کل پاکستان یوتھ کانفرنس میں جو گزشتہ ماہ کے اواخر میں یہاں منعقد ہوئی ملک کے لئے اسلامی دستور کے مطالبہ پر مشتمل قرارداد پیش کی۔

رسول نگر
(ضلع گوجرانوالہ)

ماہانہ اجتماع باقاعدگی سے ہوا۔ قرآنی مقاصد سے دلچسپی رکھنے والے مقامی اصحاب کے گھروں پر جا جا کر تبادلہ خیالات کیا گیا اور پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔

راولپنڈی

ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ راولپنڈی کی روز افزوں اہمیت (اور اس بنا پر پرویز صاحب کی ٹیپ ریکارڈ تقاریر کی بیش از پیش اشاعت) کے پیش نظر گارڈن کالج کے جوبلی ہال کو حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اگر اس سلسلہ میں عام اجتماعات کے لئے اس ہال کی اجازت مستقل طور پر حاصل ہو گئی تو قرآن کا زندگی بخش پیغام بالائی حلقوں تک پہنچ سکے گا۔

مری

موسم تبدیلی کے ساتھ مری شہر کی رونقیں ختم ہو گئی ہیں۔ بزم کے احباب میں بھی بلحاظ سکونت کافی فاصلے حائل ہو گئے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت کی پہلی سی آسانیاں بھی ان دور دراز فاصلوں میں میسر نہیں۔ ان حالات میں احباب کے اجتماعات کا وہ پہلا سا سلسلہ باقی نہیں رہا۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ بزم کا ہر رکن اب اپنے اپنے حلقہ میں لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ تقسیم پر زور دے تاکہ اس موسمی برودت میں بھی فکر و عمل کی حرارت برقرار رہے۔ طلوع اسلام کے پرچے تقسیم کئے گئے اور اس دوران میں دو ایسے گرمجوش رفقائے سفر میسر آئے ہیں جن کے سینے قرآنی فکر کی آگ سے فروزاں ہیں جو احباب گلبرگ سے منتقل ہو گئے ہیں وہ وہاں کے ہائی اسکول میں اجتماع کر لیتے ہیں اور جو گھوڑا گلی گئے ہیں انھوں نے راولپنڈی میں فیروز صاحب سے رابطہ قائم کر رکھا ہے گویا موسم سرما کے باعث بزم مری تین حلقوں میں بٹ گئی ہے ہماری بزم کے بہترین مشیر محترم صوبیدار منور خاں صاحب بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب میں بلا مقابلہ منتخب کر لئے گئے ہیں بزم ان کی اس مقبولیت عامہ پر فخر کر سکتی ہے کہ رائے دہندگان نے ان کی عدم موجودگی میں ہی انھیں بلا مقابلہ اپنا نمائندہ چن لیا۔

شیخوپورہ بزم کے دفتر کے لئے محترم شیخ عبدالغنی صاحب نے ہمایوں بازار میں اپنی دوکان کا بالائی حصہ عطا کیا ہے۔ اس کی مناسب مرمت کے بعد وہاں دفتر قائم کر دیا جائیگا اور ساتھ ہی دارالمطالعہ کا انتظام بھی۔ پمفلٹوں کی تقسیم جاری ہے اور ادارے کی مطبوعات برائے مطالعہ دی جاتی ہیں۔

چنیوٹ (ضلع جھنگ) بزم کی لائبریری کا انتظام محترم محمد صدیق صاحب کے سپرد ہے جو گھر گھر کتابوں کی تقسیم کا سلسلہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ "طلوع اسلام" کے فائل مکمل کئے جا رہے ہیں۔

ہنگو (ضلع کوہاٹ) اراکین بزم نماز عشاء کے بعد روزانہ دفتر میں جمع ہوتے ہیں اور ان روزانہ اجتماعات میں قرآن کی تعلیم و حکمت سے استفادہ کیا جاتا ہے اور دن کو ان قرآنی مقاصد کی اشاعتِ عام کی جدوجہد کی جاتی ہے۔

مردان پرویز صاحب کے مختلف ٹیپ ریکارڈز نے جو یہاں سنائے جاتے ہیں باشعور حلقوں کو بے حد متاثر کیا ہے اور نئے ریکارڈز سننے کی خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ "قرآنک اکنامکس" کے (انگریزی) پمفلٹ صاحب ذوق افراد میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ طلوع اسلام ان تعلیمیافتہ افراد میں جو اسے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے مفت تقسیم کیا جا رہا ہے۔ ادارہ کی دیگر مطبوعات بھی برائے مطالعہ تقسیم کی جاتی ہیں۔

پنڈ دادن خاں (ضلع جہلم) بزم کے ہفتہ وار اجلاس ہر جمعہ کو باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔ دیگر احباب کو بھی دعوت شرکت دی جاتی ہے۔ مختلف موضوعات پر افہام و تفہیم کی صورت پیدا کی جاتی ہے اور اس سے نہایت عمدہ اثرات پیدا ہو رہے ہیں۔ ادارہ کے نئے پمفلٹس بھی تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

چونڈہ (ضلع سیالکوٹ) قرآنی نشر و اشاعت کے سلسلے میں بزم ادارہ کے نئے انگریزی پمفلٹ "قرآنک اکنامکس" تقسیم کر رہی ہے۔

ادارۂ طلوع اسلام

طلوع اسلام کی آئندہ کنونشن کے انعقاد کے متعلق، صدر کنونشن کمیٹی کا اعلان الگ شائع ہو رہا ہے۔ بزموں سے درخواست ہے کہ وہ کنونشن میں زیادہ سے زیادہ نمائندگان بھیجیں۔

جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے، طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ مذہبی فرقے سے۔ یہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے آئینی طور پر ایک تنظیم کے ماتحت کوشش کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے نہ اسکی بزموں کی رکنیت قابلِ اعتراض ہے اور نہ ہی کنونشن میں شرکت۔

(۲) اکثر مقامات سے یہ مسرت بخش اطلاعات موصول ہونی شروع ہو گئی ہیں کہ بزموں کے لئے بعض ارکان یا طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے دلچسپی لینے والے حضرات بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہم ان تمام احباب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ انھیں اس یاد دہانی کی یقیناً ضرورت نہیں ہو گی کہ ان اداروں میں شمولیت سے ان کا مقصد ملک و ملت کی بے لوث خدمت اور ہر معاملہ میں قرآنی نقطۂ نگاہ پیش کرنا ہو گا۔ خدا انھیں اس مقصد میں کامیابی عطا کرے اور یہ حضرات اپنی سیرت و کردار سے بتا سکیں کہ قرآنی فکر انسان کے اندر کس قسم کا خوشگوار انقلاب پیدا کرتا ہے۔ واللہ المستعان۔

مکتبہ طلوعِ اسلام کی پیش کش

آپ ذیل کی کتابوں میں سے یا ان کے علاوہ کوئی اور کتاب، جو پسند فرمائیں اس سے مطلع فرمائیں۔ کتاب اصل قیمت (مع خرچ ڈاک) بذریعہ وی۔ پی آپ کے پاس پہونچ جائے گی۔ اگر آپ "پیشگی خریداروں" کے حلقہ میں شامل ہو جائیں تو پھر خرچ ڈاک بھی آپ کو ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ایک کارڈ لکھ دیجئے ——

علامہ اقبالؒ

بالِ جبریل	-/۴
ضربِ کلیم	-/۳
بانگِ درا	-/۵
جاوید نامہ	۵/۰
پس چہ باید کرد	۲/۸
زبورِ عجم	۴/۸
پیامِ مشرق	۴/۸
ارمغانِ حجاز	۴/۸
اسرار و رموز	۴/۰

حفیظ جالندھری

شاہنامہ اسلام مکمل سیٹ ہر چہار حصہ مجلد	-/۲۴
نغمہ زار	۴/۰
سوز و ساز	۵/۰
تلخابۂ شیریں	۶/۰
حفیظ کے گیت اور نظمیں مکمل سیٹ چار حصے	۴/۱۲
حفیظ جوبلی نمبر	۲/۰
ہفت پیکر	۳/۸

ابوالکلام آزاد

ترجمان القرآن حصہ اول	۱۲/۰
" " حصہ دوم	۱۲/۸
غبارِ خاطر	۶/۰
تذکرہ	۶/۰

متفرق کتابیں

اسلامی دستور اور اسلامی اقتصادیات (نصیر احمد شیخ)	۶/۰
تقسیمِ ہند (عبدالوحید خاں)	۶/۰
ابوبکر صدیقؓ (محمد حسین ہیکل)	۱۰/۰
عمر فاروق اعظمؓ (")	۲۰/۰
عمرو بن العاص (حسن ابراہیم حسن)	۵/۰
خالدؓ سیف اللہ (ابوزید شبلی)	۵/۰
رسولِ عربیؐ (جی ایس۔ دارا)	۳/۴
امیر تیمور (ہیرلڈ لیمب)	۷/۰
امیر اندلس (علی اصغر چودھری)	۴/۰
تاریخ اسلام (رئیس احمد جعفری)	۱۲/۰
تاریخ اسلام حصہ اول و دوم (عبداللہ قریشی)	۹/۰
المراشد الامین (امام غزالی)	۴/۸
حیاتِ جاوید (حالی)	۱۲/۸
درِ یتیم (ماہر القادری)	۶/۰
سیرۃ الصدیقؓ (حبیب الرحمٰن خاں شیروانی)	۲/۸
سرکارِ دوعالمؐ (دوش ادیب)	۲/۰
حضرت عمرؓ کے سیاسی نظریے (ابو یحییٰ امام خاں)	۳/۴
پاکستان کا مستقبل (محمد رفیع الدین ایم۔ اے)	۲/۸
ٹیپو سلطان (محمود بنگلوری)	۶/۸
شاہنامۂ کربلا (کیفی مرحوم)	۲/۴
دلّی سے اقبال تک (ڈاکٹر سید عبداللہ)	۵/۰
بیانِ غالب (آغا محمد باقر)	۶/۰
باطوخاں (دائی یان)	۷/۰
جینے کی اہمیت (لین یو تانگ)	۱۲/۰
آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر)	۱۵/۰
خیام (عشرت رحمانی)	۱۰/۰

—— مندرجہ بالا اور دیگر ہر قسم کی کتب ملنے کا پتہ ——

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

باسمہ تعالیٰ

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ

اسلام آگے کیوں نہ چلا؟

اس کا تجزیہ اور بصیرت افروز جواب

پرویز

شائع کردہ:- ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوعِ اسلام۔ ۲۷۔بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

۴ر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سلیم کے نام

(اسلام آگے کیوں نہ چلا؟)

نہیں سلیم! یہ سوال کچھ انوکھا تمہارے ہی دل سے نہیں اُبھرا جو اس کے زبان تک لانے میں تمہیں اس قدر تردد و تامل ہوتا۔ یہ تو ہر اس شخص کے ذہن میں پیدا ہوگا جو ہمارے عروج و زوال کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اور دیکھے گا کہ مسلمان اپنے ابتدائی دور میں اس تیزی کے ساتھ ساری دنیا پر چھا گئے کہ اس کی نظیر تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔ اور اس کے بعد وہ اس طرح مائل بہ زوال ہوئے کہ پھر ان کے اُبھرنے کی کوئی صورت ہی پیدا نہ ہوئی۔ تاریخ کے اس مطالعہ کے بعد (جو حقائق پر مبنی ہے) اظہارِ خیال کرنے والوں کے دو گروہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے (اور اس کا اظہار بیباکانہ کرتا ہے) کہ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نے عربوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی جس کی بنا پر وہ ایران اور روما کی مملکتوں پر غالب آ گئے اور ساری دنیا میں پھیل گئے لیکن اسلام میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا۔ اس لئے جب زمانہ آگے بڑھا تو اسلام ناکام رہ گیا اور مسلمانوں کا عروج انحطاط میں بدل گیا۔ اس کے بعد یہ گروہ طنزاً کہتا ہے کہ اب جبکہ زمانہ اس قدر آگے نکل گیا ہے، اُسی ناکام تجربے کے دُہرانے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔

دو گروہ

دوسرا گروہ اس قدر بے باکی کی جرأت تو نہیں کرتا لیکن اس کے دل میں بھی یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام ایک حقیقتِ ثابتہ تھا اور اُس میں فی الواقعہ یہ صلاحیت تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا، تو وہ چند قدم چل کر رُک کیوں گیا، برابر آگے کیوں نہ بڑھتا گیا؟ یہ خیال ان کے دل میں تعجب اور تشکیک کے ملے جلے جذبات اُبھارتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی ابدی صداقت کے متعلق ان کے ایمان میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔

۱؎ India Wins Freedom - Bu. M. Abul Kalam Azad.

گروہ یہ ہو یا وہ، یہ سوال بہرحال ایسا ہے جس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اور جس کا اطمینان بخش جواب، غیروں کے اعتراض کے مسکت جواب اور اپنوں کے شبہات کے ازالہ کا موجب ہوگا۔ اس لئے تم نے اچھا کیا کہ اسے بلا تکلف پوچھ کر یہ موقعہ بہم پہنچا دیا کہ میں اپنی بصیرتِ قرآنی کے مطابق اس مشکل عقدہ کو وا کرنے کی کوشش کروں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے تو یہ سمجھو سلیم! کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ تمہیں معلوم ہے کہ اس کائنات میں خدا کے متعین کردہ، غیر متبدل، محکم اصول (قوانین) کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عظیم و عجیب اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ کائنات کی ہر شے ان قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ وَلَهٗ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۳/۸۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹)۔ یہ کبھی ان قوانین سے سرکشی نہیں برتتے! اسے "کائناتی اسلام" سمجھو۔ اس کے قوانین نہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رک گئے ہیں۔ یہ برابر آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا کوئی سقم یا خلفشار نہیں۔ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ (۶۷/۳) "تخلیقِ خداوندی میں تم کوئی جھول نہیں پاؤ گے"۔

جس طرح خدا نے سلسلۂ کائنات کے لئے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار (بذریعہ وحی) عطا کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے، آگے بڑھتے اور بلند ہوتے چلے جاتے ہیں ـــــ یعنی انہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں ـــــ لیکن انسان کو چونکہ دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا نہیں کیا گیا، اس لئے اُسے اس کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے انحراف برت کر اپنے خودساختہ مسلک پر گامزن ہو ـــــ اول الذکر راستہ اسے عروج و ارتقاء کی طرف لے جائے گا اور ثانی الذکر مسلک زوال و انحطاط کی طرف ـــــ

خدا کا تجویز کردہ نظامِ زندگی (الدین یا الاسلام) تمام نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کی ضمانت دیتا ہے اور زمین کے دسترخوان پر بکھری ہوئی نعمائے خداوندی کو ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے۔ لیکن یہ چیز ان لوگوں پر شاق گذرتی ہے جو اپنی قوت کے بل بوتے پر رزق کے سرچشموں پر قابو پا کر دوسروں کو ان سے محروم رکھنے اور اس طرح ان سے اپنی من مانی کرانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لئے یہ گروہ نظامِ خداوندی (الاسلام) کی مخالفت کرتا اور اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرتا ہے

حق و باطل کی کشمکش

قرآن کی اصطلاح میں اسے حق و باطل کی کشمکش کہتے ہیں۔ اس سے تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ اسلام کائنات میں بھی کارفرما ہے اور انسانی دنیا میں بھی ـــــ اس فرق کے ساتھ کہ کائنات میں اس کی کہیں مخالفت نہیں ہوتی اور انسانوں کی دنیا میں اس کی مزاحمت ہوتی ہے۔

اب آگے بڑھو۔ تمہیں اس کا علم ہے کہ اگر بیج تندرست و توانا (صالح) ہو اور اسے ضروری سامانِ نشوونما مل جائے تو اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ اوپر کو ابھرتی، ایک دن تناور درخت بن جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہا جائے گا کہ اس بیج میں اس کی صلاحیت

ہوتی ہے کہ وہ اوپر کو ابھرے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہونچ جائے۔ جن ابدی قوانین اور مستقل اقدار کا اوپر ذکر کیا گیا ہے (اور جن کے مجموعہ کا نام الاسلام ہے) قرآن کہتا ہے کہ ان میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ وہ تمام موانعات کو اپنے راستے سے ہٹاتے ہوئے، اوپر کو ابھریں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہونچ کر رہیں۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ ..... (۳۵/۱۰) "ان خوشگوار نظریاتِ حیات میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ "خدا کی طرف" اوپر کو اُٹھتے جائیں"۔ یعنی عروج و ارتقاء کی وہ آخری منزل جسے خدا نے ان کے لئے متعین کیا ہے، اس تک پہونچ کر رہیں۔ دوسرے الفاظ میں، حق میں اس کی صلاحیت اور قوت ہے کہ وہ باطل کا مقابلہ کر کے اسے شکست دے اور اس طرح اپنے راستے

حق ہمیشہ غالب رہتا ہے

پر چلتا جائے۔ قرآن اس باب میں کہتا ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ... (۲۱/۱۸) "ہم حق کا باطل پر نشانہ لگاتے رہتے ہیں تو حق باطل کا سر توڑ دیتا ہے اور اس طرح باطل شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے"۔ باطل راستے سے ہٹ جاتا ہے اور حق پھر اپنی منزل کی طرف رواں دواں چلے جاتا ہے۔

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہمارا مشاہدہ تو اس کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں باطل کا دور دورہ ہے۔ وہی ہر جگہ مسلط نظر آتا ہے۔ حق کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ظلم۔ استبداد۔ فرعونیت۔ بددیانتی۔ دھوکا۔ فریب۔ دنیا کے بازار میں انہی کا سکہ رواں دواں ہے۔ تو پھر ہم کیسے سمجھ لیں کہ یہاں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے اور اس کشمکش میں حق ہمیشہ باطل پر غالب آتا ہے اور باطل خاسر و ناکام میدان چھوڑ جاتا ہے؟ تمہارا یہ شبہ بجا ہے لیکن ایک غلط فہمی پر مبنی۔ اس غلط فہمی کے رفع ہو جانے سے اس شبہ کا ازالہ خود بخود ہو جائے گا۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کے متعین کردہ تصوراتِ حیات میں اس کی صلاحیت تو موجود ہے کہ وہ (اپنے زور دروں سے) تمام موانعات کو راستے سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ لیکن ان کی اس طرح آگے بڑھنے کی رفتار (تمہارے اندازوں کے مطابق) بڑی سست

اس کی رفتار سست ہوتی ہے

ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ۔ "خدا اپنے امر کی تدبیر سماء سے ارض کی طرف کرتا ہے"۔ یعنی خدا اپنی مشیت کے مطابق ایک اسکیم کی تجویز کرتا ہے۔ اس کی یہ تجویز "عالمِ امر" میں ہوتی ہے جو انتہائی بلندیوں پر ہے۔ لیکن اس اسکیم کو عملی تشکیل دینے کے لئے، وہ اس کا آغاز پست ترین سطح سے کرتا ہے جیسے وہ بیج جس میں شاہ بلوط کا تناور درخت بننے کی صلاحیت ہوتی ہے، پہلے مٹی میں دبایا جاتا ہے۔ اس مقام سے اُس شاہ بلوط کی نمود کی ابتدا ہوتی ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (۳۲/۵) "پھر وہ اسکیم اس کی طرف اٹھتی ہے ایک دن میں جس کی مقدار تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار برس کی ہوتی ہے"۔ یعنی خدا کی ہر اسکیم (جو حق پر مبنی ہوتی ہے) اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ کر رہتی ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ راستے کے موانعات سے مغلوب ہو کر ناکام یا ناتمام رہ جائے۔ لیکن اس کی ترقی کی یہ رفتار بڑی سست ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ (بظاہر) آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ یہ تو پھر بھی مجرد حقائق (Abstract Truths) کی بات ہے۔ نمود و ارتقاء کی رفتار تو محسوس، مادی اشیا میں بھی اسی طرح غیر مرئی

(Invisible) اور غیر محسوس (Imperceptible) ہوتی ہے کہ آنکھ اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ علم الارتقاء (Organic Evolution) کے ماہرین بتاتے ہیں کہ کسی ایک نوع (Species) میں ذرا سی تبدیلی کے لئے لاکھوں برس کی مدت درکار ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک نوع لاکھ برس تک اسی حالت میں رہتی ہے اور پھر اس میں یک لخت تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ نہیں۔ اس میں یہ تبدیلی تدریجاً ہو رہی ہوتی ہے لیکن اس کی رفتار ایسی غیر محسوس ہوتی ہے کہ اس تبدیلی کا احساس تک بھی نہیں ہو سکتا۔ کہیں لاکھوں برس میں جا کر وہ تبدیلی مشہود شکل میں سامنے آتی ہے۔ یہ ہے "خدائے حکیم" کی وہ رفتار جس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس کا (اور قرآن کے دوسرے مقام کے مطابق پچاس پچاس ہزار برس کا) ہوتا ہے۔ تم اس سست روی کا اندازہ کرنا چاہو تو کسی پودے کے پاس بیٹھ جاؤ۔ ہفتوں، مہینوں، برسوں۔ دن رات اس کے پاس رہو۔ وہ اس دوران میں مسلسل آگے بڑھ رہا ہوگا لیکن تمہیں اس کا احساس تک بھی نہ ہونے پائے گا کہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہو رہی ہے ——— لو! مجھے یاد آ گیا۔ پچھلے سال جب تم یہاں تھے تو تمہاری گھڑی کی منٹوں کی سوئی گر گئی تھی اور صرف گھنٹوں کی سوئی رہ گئی تھی۔ دن بھر گھڑی تمہارے سامنے رہتی تھی۔ گھنٹوں کی سوئی ایک سے دو، دو سے تین، تین سے چار تک پہنچ جاتی تھی۔ لیکن تمہیں احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ گھڑی چل رہی ہے۔

غلبہ حق ہی کا ہوتا ہے

حق و باطل کی کشمکش میں حق کا غلبہ اور باطل کی شکست، اُس آہستہ خرامی سے ہوتی ہے جس میں ایک ایک دن کی مدت ہمارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ہم تاریخ کے کسی ایک دور کو لیتے ہیں (جو دس بیس برس پر مشتمل ہوتا ہے)۔ اور دیکھتے ہیں کہ اس میں باطل کا دور دورہ ہے۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ غلبہ باطل ہی کا رہتا ہے۔ اگر ہم ہزار سال کی تاریخ کا بہ دقتِ نظر سے مطالعہ کریں تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آ جائے گی کہ جہاں اور جب خدا کے متعین کردہ کسی اصول کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ نظام کا ٹکراؤ ہوا ہے، آخر الامر غلبہ خدائی اصول کو ہوا ہے اور انسانی نظام ناکام رہا ہے۔ (اس کی مثالیں ذرا آگے چل کر تمہارے سامنے آئیں گی)۔

چونکہ مسئلہ ذرا مشکل اور بات دقیق ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے اسے مختصر الفاظ میں دُہرا دوں۔ میں نے کہا یہ ہے کہ

(۱) اسلام اُن غیر متبدل اصولوں کا مجموعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے (بذریعہ وحی) عطا کیا ہے تاکہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے نوعِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

(۲) مفاد پرست گروہ اس ضابطۂ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں اور اس طرح حق اور باطل میں کشمکش کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(۳) حق میں اس امر کی صلاحیت ہے کہ وہ باطل کو شکست دے کر اپنی منزل کی طرف بڑھتا جائے۔ لیکن

(۴) اس کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ اس کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

———x———

لیکن اس کے ساتھ قرآن کچھ اور بھی کہتا ہے اور وہ اس مسئلہ کی بڑی اہم کڑی ہے۔ سورہ فاطر کی جو آیت پہلے درج کی جا چکی

اسکی رفتار تیز کی جاسکتی ہے

ہے اس کا اگلا حصہ یوں ہے اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ (۳۵/۱۰)" خوشگوار نظریاتِ زندگی میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے نصب العین کی طرف بلند ہوتے جائیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ، انسان کے اعمالِ صالحہ کی تائید بھی شامل ہو جائے تو اس سے انھیں مزید ارتفاع (بلندی) حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سے سلیم! بات صاف ہو گئی۔ یعنی قوانینِ خداوندی، اپنی عام (سست) رفتار سے خود بخود چلتے رہتے ہیں لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی جماعت انھیں اپنے ہاں عملاً نافذ کرکے معاشرہ کو ان کے خطوط پر متشکل کرلے، تو ان کی رفتار بڑی تیز ہو جاتی ہے اور ان کے جو نتائج ہزار ہزار برس میں جا کر ظہور میں آنے تھے، وہ دنوں کے اندر سامنے آجاتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ عام حالات میں، انسانی معاشرہ میں تبدیلیاں ارتقائی طور پر (By Evolution) نمودار ہوتی ہیں لیکن انسانی جماعت کی رفاقت سے یہ تبدیلیاں، انقلابی طور پر (By Revolution) ظہور میں آجاتی ہیں۔ یا علم الارتقاء کی اصطلاح میں، یہ تبدیلیاں فجائی ارتقاء سے (By Emergent Evolution) نمودار ہو جاتی ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور نقطہ بھی سمجھنے کے قابل ہے۔ جب خدا کے ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے جادہ پیما ہوتے ہیں تو ذہنِ انسانی عام طور پر انھیں اپناتا جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک تبدیلی نے ہزار برس میں جا کر نمودار ہونا ہے تو اس طویل مدت میں ذہنِ انسانی کی سطح بھی اتنی اونچی ہو جاتی ہے کہ وہ اس بلند تصور کو اپنا سکے لیکن جب کسی خاص جماعت کے اعمالِ صالحہ سے یہ حقائق غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھ جائیں تو، اس جماعت سے باہر کے انسانوں کی ذہنی سطح اتنی اونچی نہیں ہوتی کہ وہ ان حقائق کے ہم دوش ہو جائے۔ اس لئے وہ حقائق ان انسانوں کے لئے غیر مانوس رہتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کسی بچے کی تعلیم کا سلسلہ جاری کریں اور اسے بتدریج آگے بڑھاتے چلے جائیں تو وہ ایک دن نہایت آسانی سے ایم۔ اے کے مشکل ترین اسباق کو سمجھ لے گا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ اس کے سامنے کوئی مشکل سوال آگیا ہے لیکن اگر دسویں جماعت میں ایم۔ اے کا کورس اس کے سامنے رکھ دیا جائے تو اس کا ذہن اسے اپنے لئے غیر مانوس پائے گا۔ اگر ہم چاہیں کہ اسے دس سال میں ایم۔ اے تک پہنچائیں تو شروع ہی سے اس کی تعلیمی رفتار کو (اسی نسبت سے) تیز تر کرنا ہوگا جس کے لئے خاص انتظامات واہتمامات کی ضرورت ہوگی۔

انسانی عقل کا طریق

انسانی عقل کا طریق تجرباتی ہے وہ (Trial And Error) سے کسی نتیجہ تک پہنچتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ پھر اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ سینکڑوں برس کے تجربات کے بعد جا کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نظریہ نے صحیح نتائج پیدا نہیں کئے۔ اس طرح جب وہ نظریہ غلط ہوتا ہے تو عقلِ انسانی دوسرا نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس طرح پیہم تجربات کے بعد کہیں صدیوں میں جا کر وہ صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ اس وقت یہ نظریہ اس کے لئے غیر مانوس نہیں ہوتا۔ اس تمام دوران میں ذہن سے اپنا چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، وحیِ خداوندی کی رُو سے صحیح نظریاتِ زندگی بیک وقت انسانوں کے پاس آجاتے ہیں۔ اس لئے انسانی ذہن کو ان سے مانوس کرنے کے لئے خاص کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

(اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

اس طویل تمہید کے بعد سلیم! تم اصل سوال کی طرف آؤ۔ خدا کے ابدی قوانین (الاسلام) اپنی معمولی رفتار سے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے جس حد تک ذہنِ انسانی انھیں اپنا چکا تھا، وہ اس حد تک ان سے مانوس تھا۔ ان کا باقی حصہ ہنوز اس کی دسترس سے باہر تھا کہ اتنے میں سرزمینِ عرب میں نبی اکرمؐ کا ظہورِ قدسی ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے ابدی قوانین (الاسلام) کا مجموعہ بذریعہ وحی حضورؐ کو عطا فرمایا۔ ان قوانین کا جو حصہ ہنوز ذہنِ انسانی کی دسترس سے باہر تھا حضورؐ کے مخاطبین نے اسے اپنے لئے غیر مانوس پایا اور اس کی مخالفت شروع کر دی۔ آپؐ نے اپنی بے مثال تعلیم اور بے مثال عمل سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ حقائق کس طرح شرفِ انسانیت کے ضامن اور ان کی فلاح و بہبود کے کفیل ہیں۔ جن سعید روحوں نے اپنے تعصب کو ایک طرف رکھ کر انھیں سمجھنے کی کوشش کی ان کی سمجھ میں بات آ گئی اور وہ حضورؐ سے متفق ہو گئے۔ اس طرح مومنین کی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہوتی چلی گئی۔ اس جماعت کے اعمالِ صالح و تعمیری پروگرام نے خدا کے ابدی حقائق کی رفتار میں تعجب انگیز تیزی پیدا کر دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے ایسے محیر العقول نتائج مرتب ہو کر سامنے آئے کہ تاریخ کے اوراق میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ کچھ کسی مافوق الفطرت یا غیر معمولی اسباب کی رو سے ظہور میں نہیں آیا تھا۔ یہ خدا کے اسی ابدی قانون کے مطابق ہوا تھا جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ خوشگوار نظریاتِ حیات اپنے زورِ دروں سے اس کی طرف اٹھتے چلے جاتے ہیں اور (انسانوں کے) اعمالِ صالح انھیں ترفع (بلندی) عطا کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس جماعت کے اعمالِ صالح کی رُو سے ہوا تھا جنھوں نے ان قوانین کی رفتار میں ایسی غیر معمولی تیزی پیدا کر دی تھی کہ ان کے جو نتائج کہیں ہزار برس میں جا کر محسوس طور پر سامنے آنے تھے، چند دنوں میں مشہود ہو گئے۔

ظہورِ اسلام

رفتار میں تیزی

اگر یہ سلسلہ اسی طرح سے قائم رہتا تو یہ حقائق اسی تیز رفتاری سے آگے بڑھتے چلے جاتے (اور سوچو سلیم! کہ اس طرح انسان اس وقت تک کہاں پہنچا ہوتا؟) لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ انسانی جماعت کے اعمالِ صالح ان حقائق کے ساتھ نہ رہے۔ لہٰذا ان حقائق نے پھر اپنی سابقہ (معمولی) رفتار سے چلنا شروع کر دیا۔ یہ تھوڑا سا زمانہ جس میں ان حقائق کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق سامنے آ گئے تھے، وہ زمانہ ہے جس کے متعلق دنیا کے مورخین اور مفکرین یہ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اس وقت تک کامیاب رہا۔ اس کے بعد ناکام ہو گیا۔ حالانکہ جو کچھ فی الحقیقت ہوا وہ صرف اس قدر ہے کہ اسلام اپنی معمولی رفتار (ہزار ہزار برس کے ایک ایک دن) سے چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں اسے خارجی قوت مل گئی جس سے اس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی۔ بعد میں وہ خارجی قوت الگ ہو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گیا۔ بالفاظِ دیگر، نہر اپنی معمولی رفتار سے بہہ رہی تھی۔ ایک مقام پر ٹھوکر (FALL) کی وجہ سے اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ جب یہ خارجی تحرک (IMPETUS) ختم ہو گیا تو وہ پھر اپنی سابقہ رفتار سے بہنے لگ گئی۔ یہ کہنا کہ نہر صرف اتنے وقت تک بہتی رہی جب تک اس کی لہروں سے اس کی رفتار محسوس طور پر نظر آتی تھی۔ اور اس کے بعد وہ جو بے رواں کی بجائے ساکت و ساکن جوہڑ بن گئی، کم فہمی کی دلیل ہے۔

پھر وہی آہستہ خرامی

چار اہم شقیں

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، اس میں تین چار باتیں مزید غور کے قابل ہیں۔

(۱) وہ کیا چیز تھی جس سے اُس خاص دَور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کے اعمالِ صالح، خدائی قوانین کے لئے اس قدر تحرک کا موجب بن گئے۔

(۲) بعد میں وہ چیز باقی کیوں نہ رہی۔

(۳) اگر وہ چیز باقی نہیں رہی تھی، تو بھی اُس زمانے کے عام انسانی ذہن نے اِن بلند حقائق کو اپنا کیوں نہ لیا۔ اور

(۴) اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ قوانینِ خداوندی، بعد میں پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گئے، اور اب تک چلے جا رہے ہیں۔ یعنی یہ نہر جوئے رواں ہے۔ ساکن جوہڑ نہیں جو ایک مقام پر رک کر کھڑی ہو گئی ہو اور آگے چلنے کے قابل نہ رہی ہو۔

یہ سوالات ایسے ہیں جو بڑے گہرے غور و تدبر کے محتاج ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا اسے بڑی توجہ سے سمجھنے کی کوشش کرنا۔

سب سے پہلے شقِ اول کو لو۔ یعنی اس سوال کو کہ وہ کیا چیز تھی جس سے اُس خاص دَور میں انسانوں کی ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس کے اعمالِ صالح سے خدائی قوانین کو ایسی تقویت (Momentum) مل گئی۔ یہ چیز، سلیم! بڑی صاف اور سیدھی تھی۔ قرآن

نظامِ تعلیم و تربیت

کریم نے اسے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ نبی اکرمؐ کا طریقِ عمل یہ تھا کہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ ..... (۲/۱۲۹)۔ اس پروگرام کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ یہ کہ آپؐ لوگوں کے سامنے قرآن پیش کرتے تھے۔ یعنی جن لوگوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی تھی ان کے سامنے قرآن اور خالص قرآن پیش کیا جاتا تھا۔ اس میں انسانی خیالات، تصورات، نظریات، معتقدات کی قطعاً آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے قرآن ملتا تھا اور اسی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جاتی تھی۔ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸)۔ "میں اور میرے متبعین خدا کی طرف دعوت علیٰ وجہ البصیرت دیتے ہیں"۔ یعنی قرآن کو دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی بنا پر پیش کیا جاتا تھا۔ اسے نہ معجزات کے زور سے منوایا جاتا تھا، اور نہ ہی کسی کے سر پر تلوار رکھ کر اسے مسلمان ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

جو لوگ اس طرح علیٰ وجہ البصیرت (دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ) قرآن کی صداقت کو تسلیم کر لیتے، ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ نبی اکرمؐ انھیں سمجھاتے کہ خدا کے احکام و قوانین (الکتاب) کیا ہیں اور ان کی غرض و غایت (الحکمۃ) کیا۔ اس طرح انھیں الاسلام کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اپنی عقل و فکر سے کام لینے اور پیش آمدہ معاملات کا حل دریافت کرنے کے طور طریقے سکھائے جاتے۔

اور اس کے ساتھ ہی، صحیح آزادی کی ایسی فضا پیدا کی جاتی جس سے ان کی ذات (Personality) کی نشوونما

(تزکیۂ نفس) ہوتی جاتی۔ ان کی ذہنی اور قلبی صلاحیتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی۔ انھوں نے (اس سے پیشتر) انسانوں کی خودساختہ رسم و قیود کی جن زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ رکھا تھا، وہ سب ایک ایک کرکے ٹوٹ جاتیں اور وہ محسوس کر لیتے کہ وہ دنیا میں نہ کسی انسان کے محکوم ہیں نہ محتاج۔ قرآنی معاشرہ میں کوئی کسی کا محکوم و محتاج نہیں ہوتا۔ اس سے ان کی ذات کا نشوونما ہوتا۔

یہ تھا وہ سیدھا سادہ پروگرام جس سے نبی اکرمؐ نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی تھی جس کے اعمالِ صالح، قوانین خداوندی کی رفتار میں اس قدر محیر العقول تیزی پیدا کرنے کا موجب بن گئے تھے اور اس طرح ایک ایسا معاشرہ قائم ہو گیا تھا جس میں اسلام کے درخشندہ و تابناک نتائج چند دنوں میں دنیا کے سامنے آ گئے تھے۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں فرقِ مدارج

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جتنے لوگ نبی اکرمؐ کی زندگی میں مسلمان ہو گئے تھے (اگرچہ اصطلاح میں ان سب کو صحابہ کہتے ہیں) ان سب کو تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے استفادہ کے یکساں مواقع حاصل نہیں ہوئے تھے۔ قرآن اس حقیقت کو واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ حجرات میں ان بدوی قبائل (اعراب) کا ذکر ہے جو نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں اسلامی مملکت کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدوی قبائل کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ (۴۹/۱۴) "ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے تم یہ کہو کہ ہم (اسلامی مملکت کے) مطیع و فرمانبردار ہو گئے ہیں۔ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا"۔ یہ تو بدوی قبائل کے متعلق تھا۔ خود قریش کے متعلق (جو صلح حدیبیہ یا فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گئے تھے) فرمایا کہ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا۔ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۵۷/۱۰) "تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے (راہِ خدا میں) اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں۔ اور جنھوں نے فتح کے بعد اپنا مال خرچ کیا اور لڑائیاں لڑیں یہ دونوں (گروہ) برابر نہیں ہو سکتے۔ اول الذکر کے درجات ثانی الذکر کے مقابلہ میں بہت بلند ہیں۔ اگرچہ اسلام کی برکات و حسنات کے سلسلہ میں اللہ کے وعدے دونوں کے ساتھ ہیں"۔ یہ (بلند مدارج کے حامل) وہ حضرات ہیں جنھیں قرآن نے "مومن حقا" کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸/۷۴) "اور جو لوگ ایمان لائے۔ انھوں نے ہجرت کی۔ اور اللہ کی راہ میں ہر قسم کا جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنھوں نے (ان مہاجرین کو) پناہ دی۔ اور (دین کے استحکام میں ہر قسم کی) مدد کی۔ یہی لوگ ہیں سچے اور پکے مومن۔ ان کے لئے ہر تخریب سے حفاظت کا سامان اور باعزت رزق ہے"۔ جنھوں نے ان کے بعد ہجرت کی اور جہاد کیا، ان کے متعلق کہا گیا کہ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (۵۹/۸) "وہ بھی تم میں سے ہیں"۔ یہی (اول الذکر) وہ "السابقون الاولون" ہیں جنھیں قرآن نے "محمد رسول اللہ والذین معہ" کہہ کر پکارا (۴۸/۲۹) اور شجرِ اسلام کی آبیاری میں ان کی خدماتِ جلیلہ کو وجد و مسرت کے عالم میں سراہا ہے (۴۸/۲۹)۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا سلیم! کہ بعد کے مسلمانوں کے ایمان و عمل کی قرآن نے تعریف نہیں کی۔ جنھوں نے

ان "السابقون الاولون" کی حسن کارانہ انداز سے پیروی کی۔ ان کے متعلق بھی قرآن نے کہا ہے کہ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (۹/۱۰۰)۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔" جو کچھ میں نے اوپر کہا ہے اس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ اس جماعت میں بعد میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو اس انداز سے اسلام نہیں لائے تھے جس انداز سے السابقون الاولون ایمان لائے تھے نیز بعد میں آنے والوں کو تعلیم نبوی سے نسبتاً کم حصہ ملا تھا۔ "السابقون الاولون" برسوں کے غور و فکر کے بعد اس وقت ایمان لائے تھے جب ایمان لانے کے معنی اپنے آپ کو دنیا بھر کی مخالفت کا نشانہ بنا لینا اور ہر قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونا تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان اسی صورت میں لایا جا سکتا تھا جب انسان انتہائی غور و فکر کے بعد صداقت کو پہچان لے۔ لیکن جب اسلامی مملکت قائم ہو گئی تھی اور مسلمانوں کو ہر طرف غلبہ حاصل ہو رہا تھا اس وقت ایمان لانا (قرآن کے الفاظ میں) اپنے آپ کو اسلامی مملکت کے سامنے (SURRENDER) کر دینے کے مرادف تھا۔ یہ تو تھا ان دو گروہوں کے ایمان لانے کے محرکات کا فرق۔ اس کے ساتھ دوسرا اہم فرق یہ بھی تھا کہ بعد میں مسلمان ہونے والوں کو تعلیم و تربیتِ نبوی سے استفادہ کا بہت کم موقعہ ملا تھا۔

اب اگلی شق کو سامنے لاؤ۔ یعنی اس سوال کو کہ جس پروگرام کے مطابق نبی اکرمؐ نے اس قسم کی جماعتِ مومنین پیدا کر دی تھی، وہ پروگرام آگے کیوں نہ چلا؟ اس سلسلہ میں تم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ صاحب! وہ تو رسولؐ کی منفرد شخصیت تھی جس نے اپنی بے مثال روحانی

ایک غلط فہمی کا ازالہ

قوتوں سے اس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ (رسول کے علاوہ) دوسرے انسانوں کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ اس لئے جب رسول اللہ دنیا سے تشریف لے گئے تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا! یہ سلیم! بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے دل سے نکالنا نہایت ضروری ہے۔ اگر یہ خیال دل میں باقی رہے تو اس کا صرف اتنا ہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ آگے نہیں چل سکتا تھا۔ اس سے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اب اگر ہم لاکھ چاہیں، تو بھی اسلام کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے۔ اس تصور کا نتیجہ، ناامیدی جاودیہ ہوتا ہے۔ یعنی اپنی حالت کو سنوارنے اور مستقبل کو روشن کرنے کی طرف سے ابدی مایوسی۔ یہ جو ہم میں، ہر صدی کے بعد خدا کی طرف سے "مجدد" کی آمد یا آخری زمانے میں "ظہورِ مہدی" کا عقیدہ آ گیا ہے، یہ اسی مایوسی کا پیدا کردہ ہے۔ (قرآنِ کریم میں ختمِ نبوت کے بعد، کسی آنے والے کا ذکر نہیں) اور یہ جو ہمارے ہاں آئے دن نبوت کے دعوے ہوتے رہتے ہیں ان کا بنیادی سبب بھی یہی غلط تصور ہے (کہ اسلام کا احیاء نبی کے بغیر ہو نہیں سکتا) لہٰذا اس غلط تصور کا ذہن سے نکالنا ازبس ضروری ہے کہ اسلام نے جو کچھ کر کے دکھایا تھا وہ نبی اکرمؐ کی مافوق الفطرت قوتوں کا نتیجہ تھا۔ آپؐ کے بعد نہ وہ سلسلہ باقی رہ سکتا تھا۔ نہ اب اس کا امید وار ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے جو کہلوایا ہے کہ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ ..... (۱۸/۱۱۰) "حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔" یہ اسی بنیادی غلط فہمی کے دور کرنے کے لئے ہے۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ حضورؐ کی یہ وہ خصوصیت تھی جس میں کوئی دوسرا

جو کچھ رسول اللہؐ نے کیا تھا وہ بعد میں بھی ہو سکتا تھا

شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خصوصیت مافوق الفطرت تھی۔ لیکن اس کے بعد اسلام کو ایک عملی نظام کی صورت میں متشکل کرنے کے لئے آپؐ نے جو کچھ کیا وہ کسی مافوق الفطرت قوت کی بنا پر نہیں کیا۔ وہ بشری حیثیت سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اعلان کرتا ہے کہ حضورؐ کو قرآن کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد خدا کی طرف سے وحی دیئے جانے کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن اس وحی کو ایک عملی نظام بنانے کے لئے آپؐ نے جو کچھ بشری حیثیت سے کیا، وہ سلسلہ بدستور آگے چلا۔ خلافت (یعنی آپؐ کی جانشینی) اسی حیثیت سے اور اسی مقصد کے لئے تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے یہ کہہ کر واضح کر دیا تھا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ..... (۳/۱۴۴) "محمدؐ بجز اس نیست کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی رسول ہو گذرے ہیں۔ سو اگر یہ (کل کو) مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ یہ سلسلہ تو آپؐ کی ذات تک ہی محدود تھا) اپنی پہلی روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟" اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ حضورؐ کی ذات کے ساتھ ختم ہونے والا نہیں تھا۔ اسے آگے چلنا تھا اور (نبی کے بغیر) یہ آگے چل سکتا تھا۔ آپؐ نے جو فرمایا تھا کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ۔ "میں تمہیں اللہ کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں"، تو اس کے بعد اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ کا اضافہ کیا تھا (۱۲/۱۰۸)۔ یعنی میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (۷/۱۵۷) "وہ معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے"۔ اور یہی فریضہ آپؐ کی اُمت کا بھی قرار دیا ہے جب کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)، تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو۔ اور منکر سے روکتے ہو"۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ "تلاوتِ آیاتِ قرآنی۔ تعلیم کتاب و حکمت۔ اور تزکیۂ قلوب و اذہان" کا جو پروگرام حضورؐ نے اختیار فرمایا تھا وہ آپؐ کی ذات تک محدود تھا۔ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اور شجرِ اسلام نے جو ثمرات عہدِ نبویؐ میں دینے شروع کئے تھے ان کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ لیکن کچھ وقت کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

یہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا؟

رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ میں سلسلۂ دعوت و تبلیغ (پہلے) مکہ اور اس کے گرد و نواح تک محدود رہا اور اس کے بعد مدینہ اور اس کے گرد و پیش تک۔ جن حضرات (رضؓ) کی تعلیم و تربیت اس دوران میں ہوئی، اسلام کے حقائق و تصورات ان کے قلب و دماغ میں پختگی سے مرتسم ہو گئے تھے۔ بعد میں جب پورا عرب مسلمان ہو گیا تو ان کی حالت وہی تھی جس کی طرف قرآن نے "اعراب کے مسلمان ہونے" کے ضمن میں اشارہ کیا ہے (جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں) ایک تو ان کے مسلمان ہونے کے محرکات اور تھے۔ یعنی ابتدائی حضرات (رضؓ) ایک مدت تک غور و فکر کے بعد اسلام علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتے تھے، لیکن یہ (بعد کے مسلمان) قرآن کے الفاظ میں "اسلامی مملکت کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے تھے۔ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ بدقسمتی سے انھیں تعلیم و تربیت نبویؐ سے استفادہ کا موقعہ کم ملا تھا۔

ان کی تعداد زیادہ تھی اور یہ ملک کے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ نیز اس کے بعد نبی اکرمؐ زیادہ عرصہ تک اس دنیا میں تشریف فرما نہ رہے حضورؐ کی وفات جلدی ہو گئی۔

یہ حالت خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ مقدسہ کے آخری ایام میں تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی حدود بہت وسیع ہو گئیں۔ (ان کے زمانہ میں مملکتِ اسلامی بائیس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی)۔ ایران کی پوری مملکت، اور روما کا بیشتر حصّہ، پرچمِ اسلام کے زیر سایہ آ گیا تھا۔ اگر ان علاقوں کے باشندے مملکتِ اسلامی سے صرف معاہدات کرتے اور اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے، تو صورتِ حالات اور ہوتی۔ لیکن یہ سب مسلمان ہو گئے۔ اس سے نقشہ بدل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ بالکل اسی طرح مسلمان ہوئے تھے جس طرح (قرآن میں بیان کردہ) "اعراب" مسلمان ہوئے تھے۔ (بلکہ ان کی حالت اُن سے بھی

فتوحات کا سلسلہ دراز

گئی گذری تھی۔ وہ تو پھر بھی برسوں سے اپنے گردوپیش صحیح مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے اور اسلامی تعلیمات کا چرچا سن رہے تھے۔ ان نومسلموں کو یہ بات بھی میسر نہیں ہوئی تھی)۔ ان نومسلموں کی تعداد اس قدر کثیر، رقبہ اس قدر وسیع۔ اور (اُس زمانے میں) وسائلِ رسل و رسائل اس قدر محدود۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ناممکن نہیں تو بیحد مشکل ضرور تھی جس انداز سے السابقون الاولون کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کو اس کا بڑا خیال تھا اور وہ اس کے متعلق بہت کچھ سوچتے تھے۔ یہی وہ مقامات ہیں جن کی نزاکت و اہمیت کے پیش نظر قرآن نے (سورۃ النصر) میں یہ کہہ کر تاکید کی ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ "جب خدا کی فتح و نصرت آ جائے اور تو دیکھے کہ لوگ خدا کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں" تو اُس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ مقصد حاصل ہو گیا۔ ہمارا پروگرام ختم ہو گیا۔ نہیں۔ اس وقت تو اپنے پروگرام پر اور شدّت سے عمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰)۔ (اُس وقت) اپنے نشو و نما دینے والے کی حمدیت کے پروگرام میں اور زیادہ سرگرمی دکھاؤ۔ اس سے حفاظت کا سامان طلب کرو۔ وہ (اپنی رحمت کے ساتھ) تمہاری طرف رجوع کرنے والا ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس کا اس قدر احساس تھا کہ (ابنِ حزم کی تحقیق کے مطابق) آپ نے قرآن کریم کا کم و بیش ایک لاکھ نسخہ مملکت کے طول و عرض میں پھیلا دیا تھا۔

حضرت عمرؓ کی بے وقت شہادت

اس کے بعد ان کے سامنے تعلیم و تربیت کا مزید پروگرام بھی تھا لیکن (امت اور اسکے ساتھ عالمِ انسانیت کی) انتہائی بدقسمتی کہ قبل اس کے کہ وہ اپنے پیش نظر پروگرام کو عمل میں لاتے، وہ غیر متوقع طور پر (بے وقت) شہید کر دیئے گئے اور (نومسلموں کا) یہ پورے کا پورا ثر اوہ ناپختہ رہ گیا۔

ظاہر ہے کہ جب اس قدر کثیر آبادی، اس انداز سے ایک نیا دین قبول کرے تو وہ صرف "مملکت کی فرمانبرداری" کی حد تک "نیا دین" ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے معتقدات، تصورات، نظریات سب وہی رہتے ہیں جو پہلے تھے اور جو صدیوں سے ان میں متوارث چلے آ رہے تھے۔ (تم نے سلیم! بابا بھیکو خان کو دیکھا تھا۔ اس کا خاندان دو پشتوں سے مسلمان تھا لیکن بابا کی حالت یہ تھی کہ جب چھینک آتی بے ساختہ "وجے نندی" اس کے منہ سے نکل جاتا۔ میں نے اس سے ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگا کہ میاں بیجے نندی جاتی جائے گی۔

الحمد للہ آتی آئی گی — یہ بالکل ٹھیک ہے، پرانی نہ تدیاں، تعلیم و تربیت سے جاتی ہیں، الیسا نہ ہو تو پھر یہ اعماقِ قلب سے بمشکل نکلتی ہیں۔ معاشرہ کے اثر سے، ان کے لباس میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن یہ جاتی نہیں۔ اور ان کے لباس میں تبدیلی آجانا اور بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے)۔

یہ تو ان نو مسلم ممالک کے عوام کی حالت تھی۔ جہاں تک ان کے اوپر کے طبقے کا تعلق تھا، بات اور بھی گہری تھی۔ انھوں نے اُن عربوں سے شکست کھائی تھی جنھیں وہ ابھی کل تک وحشی اور جنگلی شمار کیا کرتے تھے۔ اور شکست بھی ایسی جس سے ان کی اس قدر وسیع سلطنت اور ایسی قدیم تہذیب کا خاتمہ ہوگیا۔ وہ ہونے کو تو مسلمان (یعنی اسلامی مملکت کے فرمانبردار) ہو گئے لیکن اس شکست اور محکومی کا احساس ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور اپنے حریف عربوں کی شان و شوکت کے منظر سے ان کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

جذبۂ انتقام

انھوں نے یہ انتقام دو طرح سے لیا۔ ایک تو بلحاظِ سیاست، جہاں انھوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے اُمتِ واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اور دوسرے، مذہب کے میدان میں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جس چیز نے عربوں کو اس قدر قوت اور اقتدار عطا کر دیا ہے وہ اسلام کے حقائق ہیں۔ جب ہرمزان، پابجولاں حضرت عمرؓ کے سامنے آیا اور آپ نے اس سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ کل تک تمہاری قوت کا یہ عالم تھا کہ عرب تمہاری سرحدوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جراءت نہیں کر سکتے تھے، اور اب یہ کیفیت ہے کہ تم کسی میدان میں بھی ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے؟ تو اس نے جو کچھ جواب میں کہا، وہ سلیم! سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا

کل تک طاقت کا مقابلہ طاقت سے تھا جس میں ہم بہت آگے تھے۔ خدا نہ تمہارے ساتھ تھا نہ ہمارے ساتھ۔ اب جس وقت ہم میں اور تم میں مقابلہ ہوتا ہے تو تمہارے ساتھ خدا ہوتا ہے اور ہمارے ساتھ نہیں ہوتا۔[1]

یہ بات اس نے بڑے پتے کی کہی تھی۔ اہلِ ایران کے اربابِ فکر و نظر کا طبقہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ خدا کے ابدی قوانین ہیں جن کی اتباع سے اس قوم میں اس قدر انقلاب واقع ہو گیا ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنا بدلہ لینے کے لئے اسکیم ہی یہ سوچی کہ ان لوگوں کو قوانینِ خداوندی (کتاب اللہ) سے دور ہٹا دیا جائے۔ اس کے لئے انھوں نے کیا یہ کہ تمام غیر اسلامی معتقدات و تصورات کو اسلام کا لبادہ اوڑھا کر مسلمانوں کے معاشرے میں داخل کرتے چلے گئے، اور اس طرح خدا کے ابدی قوانین کی جگہ، انسانوں کے خود ساختہ قوانین و تصورات نے لے لی۔ (اس وقت جو اسلام دنیا میں رائج ہے، اس کا بیشتر حصہ انہی قوانین و تصورات پر مشتمل ہے)۔ اس حقیقت کو مصری مؤرخ محمد حسین ہیکل نے اپنی مشہور کتاب

عجمی سازش

— عمر فاروق اعظمؓ — میں عمدہ انداز سے بیان کیا ہے۔ اس نے پہلے ان خیالات کو پیش کیا ہے جو اس نے مؤرخ پر تاریخ المورخ (Historians' History of the World) میں

---

[1] قرآن کی اس آیت کا ترجمہ سمجھئے جس میں کہا گیا ہے کہ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَھُمْ (۴۷/۱۱) یہ اس لئے ہے کہ اللہ مومنین کا سرپرست اور کارساز ہے اور کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں۔

ہیں۔ اور اس کے بعد ... ئے لکھی ہے۔ تاریخ اور مورخ کا بیان (ہیگل کے الفاظ میں) یہ ہے کہ

(ایرانیوں کی[1]) مذہب کی اس تبدیلی کا اثر سیاسی پہلو پر بھی پڑا۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو (حضرت) محمدؐ کے چچازاد بھائی اور شرعی وارث[2] (حضرت) علیؓ عربی کے گرد جمع ہو گئے جنہیں خلافت سے دور رکھا گیا تھا اور ان کے چاروں طرف جلال و تقدس کا وہ ہالہ قائم کر دیا گیا جو ان کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ اور پھر جس طرح ان کے بزرگ کسریٰ کو آسمان کا بیٹا، مقدس بادشاہ کے لقب سے ملقب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اسے "سید و مرشد" لکھا جاتا تھا، اسی طرح انھوں نے بھی اپنے اسلام کے زمانے میں (حضرت) علیؓ کو امام کا لقب دیدیا جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معانی کا مالک ہے اگر اس کے حامل میں دُنیوی اقتدار اور عقلی برتری جمع ہو جائیں۔

جب (حضرت) علیؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت) حسنؓ اور (حضرت) حسینؓ کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے۔ کہا جاتا ہے کہ (حضرت) حسینؓ نے اکاسرۂ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس ازدواج کے بعد امامت، مقدس حق سے رشتہ بداماں ہو گئی۔ پھر کربلا کے میدان میں (حضرت) حسینؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔

وہ بغاوت جس نے بنو امیہ سے حکومت چھین کر رسول اللہ (ص) کے قرابت داروں، بنو عباس، کو تخت پر بٹھا دیا، ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی جس کے ذریعے انھوں نے اپنے اصول امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جسے تاج پہنانے کی راہ میں اپنی تمام کوششیں صرف کر دی تھیں۔

(ہیگل، اردو ترجمہ صفحہ ۲۰-۲۱۹)

اس اقتباس کے بعد، ہیگل لکھتا ہے۔

یہ واقعات جو تاریخ الورخ میں لکھے ہیں اور جن کا ذکر تمام مورخین نے کیا ہے، عہد فاروقیؓ کے بعد پیش آئے۔ یہاں ہم نے ان کا ذکر، پڑھنے والوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرنے کے لئے کیا ہے کہ ایرانیوں کے دل شروع ہی سے عربی حکومت پر مطمئن نہیں تھے، بلکہ وہ اس سے ابا کرتے تھے۔ اول اول انھوں نے اس کے

---

[1] ان نومسلموں میں یہودی، عیسائی اور ایران کے مجوسی سب ہی شامل تھے۔ لیکن چونکہ ان میں ایرانیوں کی بہت زیادہ کثرت تھی اور انہی نے سب سے زیادہ اسلام کو متاثر کیا۔ اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم جب عجمی اسلام کہتے ہیں تو اس سے مراد ہر غیر قرآنی نظریہ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں سے آیا ہو۔

[2] خلافت میں وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (طلوعِ اسلام)

> خلاف اعلانیہ بغاوت کرنی بھی چاہی لیکن اس میں ناکامی ہوئی تو دوسرے ذرائع سے اقتدار حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرنے لگے اور عام زندگی کے تمام میدانوں میں انھیں اقتدار کا بہت بڑا حصہ بھی مل گیا۔ مسلمانوں کے ایران فتح کرنے سے ایرانی اس قدر شکستہ دل تھے کہ ان کے چند آدمی حضرت عمرؓ کی جان کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت جو فتح خراسان کے کچھ ہی دن بعد ہوئی، ایرانی سازش ہی کا نتیجہ تھی۔
>
> (ایضاً صفحہ ۲۲)

تم جانتے ہو سلیم! کہ میں نہ شیعہ ہوں نہ سنی۔ اس لئے مجھے مسلمانوں کے کسی فرقے کے مخصوص معتقدات سے کوئی تعلق نہیں ——— میں ہر اُس عقیدہ اور تصور کو غلط سمجھتا ہوں جو قرآن کے خلاف ہو ——— اس لئے مسئلہ زیر نظر کو بھی میری نگاہ فرقہ وارانہ عینک سے نہیں دیکھتی۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مفتوحہ علاقوں کے نومسلموں نے اپنے معتقدات کو اسلام کا رنگ دے کر مسلمانوں کے معاشرے میں پھیلا دیا۔ اور آہستہ آہستہ انھیں اُس "خدا" (یعنی کتاب خدا) سے بے گانہ بنا دیا۔ جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے غلبہ کا باعث تھا۔ اس طرح انھوں نے فولادی شمشیروں کا بدلہ ذہنی شمشیروں کے ذریعے لیا۔ ان کی اس سازش کو اس (بدقسمت) واقعہ سے اور تقویت مل گئی کہ عباسیوں نے سلطنت ہی ایرانیوں کے بل بوتے پر حاصل کی تھی جس سے ان کا اقتدار معاشرے کے ہر گوشے پر چھا گیا تھا۔ اور چونکہ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے اس لئے ان کا وضع کردہ "جدید اسلام" کتابی شکل میں بھی عام ہو گیا۔ ہمارے ہاں جو کچھ دین کے نام سے پڑھایا جاتا ہے وہ بیشتر انہی کتابوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حادثہ کے بعد ہماری تاریخ (سیاست اور مذہب کے دونوں میدانوں میں) انہی عجمی ریشہ دوانیوں کی متنوع داستان ہے۔

یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر صحیح اسلام سے متعلق تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جسے نبی اکرمؐ نے شروع کیا اور جو خلافت کے اولین ایام تک جاری رہا، آگے چل کر رُک گیا ——— اور نہ صرف یہ کہ وہ سلسلہ رک گیا بلکہ اس کی جگہ ایک "نئے" اسلام نے لے لی ——— اس ضمن میں بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ لڑائیاں نہ لڑی جاتیں تو اسلام اس مصیبت سے بچ جاتا جو ان نومسلموں کے ہاتھوں اس پر وارد ہوئی

یہ فتوحات نہ ہی ہوتیں تو ——— اچھا تھا؟

لیکن وہ اس رائے کے اظہار کے وقت ایک اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ لڑائیاں، جوع الارض (ہوس ملک گیری) کی تسکین کے لئے نہیں لڑی گئی تھیں۔ میں اپنے موضوع سے دُور ہٹ جاؤں گا ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ ان لڑائیوں کے محرکات و اسباب کیا تھے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ

(۱) اسلام ایک نظامِ زندگی ہے جو صرف ایک آزاد، اسلامی مملکت میں عملی شکل میں سامنے آ سکتا ہے۔ یہ تھا وہ بنیادی مقصد جس کے لئے نبی اکرمؐ نے ایک مملکت کی تشکیل کی اور اس مملکت کا تحفظ، خلافت نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔

(۲) ایران اور رُوم کی مملکتیں، اس جدید اسلامی مملکت کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ یہ مملکت ان کی نگاہوں میں حریف تازہ تھی اور وہ لوگ اس کے استحکام میں اپنے لئے سخت خطرہ محسوس کرتے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اس مملکت کو صفحۂ ہستی سے

بٹھا ڈالیں۔ اگر خلافت کے اس دور میں، ان مملکتوں کے مشوم عزائم کی روک تھام نہ کی جاتی تو اسلامی مملکت کا وجود باقی نہ رہتا۔ اس مقصد کے لئے جو سعیٔ اسلامیہ کا آگے بڑھنا ناگزیر تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے، اگر یہ ممالک صرف معاہدات کر لیتے تو بھی صورت مختلف ہوتی لیکن وہاں کے باشندے (رشا شب) مسلمان ہو گئے اور اس سے وہ خرابیاں پیدا ہو گئیں جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ اس پر انتہائی بدبختی یہ کہ حضرت عمرؓ بے وقت شہید کر دیئے گئے۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے اور ان ممالک میں اسلام مستحکم طور پر رائج ہو جاتا تو پھر اس قدر خطرات پیدا نہ ہوتے۔

(۳) اس مقام پر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اسلامی مملکت میں صرف دفاعی جنگ کی شکل ہی پیدا نہیں ہوتی۔ جنگ کی ایک اور صورت بھی لاحق ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی دوسری مملکت کے علاقہ میں (غیر مسلم) انسانوں پر سخت مظالم ہو رہے ہوں اور ان بیچاروں کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو تو اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان مظلوموں کی مدافعت کے لئے ہر ممکن کوشش کرے۔ جس کی آخری (اور بعض حالات میں ناگزیر) صورت جنگ ہوتی ہے۔ (یہ وہی مقصد ہے جس کے لئے اب تجویز ہو رہا ہے کہ اقوامِ متحدہ (U. N. O) کے پاس اپنی فوجیں ہونی چاہئیں تاکہ وہ انہیں عندالضرورت ان علاقوں میں بھیج سکے جہاں قانون شکنی ہو رہی ہو اور اس کی روک تھام کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے)۔ یہ بھی ایک مقصد تھا جس کے لئے خلافت کو اپنی فوجیں بعض مقامات کو بھیجنی پڑیں۔

ان حالات کے پیشِ نظر، سلیم! تم اس سے متفق ہو گے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خلافت کو یہ لڑائیاں نہیں لڑنی چاہیئے تھیں، وہ حقیقت سے کس قدر بے خبر ہیں۔

انسانی ذہن نے اسلامی حقائق کو اپنایا کیوں نہ؟

اب تم تیسری شق کو لو۔ یعنی اس سوال کو کہ اگر تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جاری نہ بھی رہ سکا تھا، تو بھی عام ذہنِ انسانی نے اسلام کے ان حقائق کو، جو اس طرح بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آ چکے تھے، خود بخود کیوں نہ اپنا لیا؟ اس نے خود ساختہ قوانین کو ان پر کیوں ترجیح دی؟ اس سوال کے متعلق ضمناً پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ یعنی جب ابدی حقائق اپنی عام رفتار سے چلتے ہیں تو ذہنِ انسانی ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب وہ انقلابی طور پر نمودار ہوتے ہیں تو اپنے زمانے کی سطح سے بہت اونچے ہوتے ہیں اس لئے عام انسانی ذہن ان کا خوگر نہیں ہوتا جب تک خاص تعلیم و تربیت سے اُسے ان کے لئے تیار نہ کیا جائے۔ اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا کرتے ہیں کہ ہر انقلابی آواز قبل از وقت ہوتی ہے۔ "انقلابی آواز" کے معنی ہوتے ہیں خدا کے کسی ابدی قانون کو انسانی رفتار سے سامنے لانے کی دعوت۔ اور "قبل از وقت" سے مفہوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں وہ آواز اٹھتی ہے، اُس زمانے تک کا انسانی ذہن اُس قانون سے مانوس نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانے کا انسانی ذہن اس قانون سے مانوس ہو چکا ہو تو وہ آواز انقلابی نہیں ہوتی، اُسے اُسی فضا کی پیداوار کہا جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو کہا جاتا ہے کہ انقلابی آواز کے لئے اس کا دور سازگار نہیں ہوتا۔ "سازگار نہیں ہوتا" سے مراد یہ ہے اُس دور کے انسان اس آواز کو اچھی طرح (Appreciate) نہیں کر سکتے۔ ان کی فکری سطح اتنی اونچی

نہیں ہوتی کہ وہ اس غیر معمولی آواز سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ وہ آواز ان کے لئے بڑی غیر مانوس ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ تم رسول کی دعوت کو تو چھوڑو، کہ وہ اپنے دَور سے صدیوں آگے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں تو عام نابغہ (Genius) کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ہاتھوں اپنی قدر ناشناسی کا رونا روتے مرجاتا ہے۔ تم اپنے محبوب شاعر غالبؔ کو دیکھو، وہ کس طرح اپنے زمانے کی پستی سطح کا شکوہ سنج ہے! کہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ ـــ مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست ـــ کہیں اپنی اس دشواری کا گلہ خواں ہے کہ ـــ گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل ـــ لیکن چونکہ اپنے مقام اور اپنے دور کی سطح سے خوب واقف ہے اس لئے نہایت حتم و یقین اور خود اعتمادی سے یہ کہہ کر اپنے دور سے آگے نکل جاتا ہے کہ

زمانہ کی شکوہ سنجی!

قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

ایں مے از قحطِ خریداراں کہن خواہد شدن

یہی کچھ اقبالؔ کے ساتھ ہوا، وہ بھی اپنے آپ کو "گُلِ نخستیں"، "آدمِ اول" اور "شاعرِ فردا" کہتا ہوا چلا گیا۔ اور اپنی آواز کے قبل از وقت ہونے کا اعلان ان الفاظ میں کر گیا کہ

چوں رختِ خویش بربستم ازیں خاک　　ہماں گفتند با ما آشنا بود

ولیکن کس ندانست ایں مسافر　　چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اور غالبؔ ہی کی طرح یہ "پیش گوئی" کر گیا کہ

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند

جہانے را دِگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اور ایک غالبؔ اور اقبالؔ ہی پر کیا موقوف ہے۔ یہ جو تمہیں آج مختلف ممالک کی تاریخ میں آسمانِ فکر و نظر کے درخشندہ تارے نظر آ رہے ہیں، ان کے ساتھ ان کے زمانے نے یہی کچھ کیا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں روٹی کے ٹکڑے تک کے محتاج رہے۔ محتاج ہی نہیں رہے بلکہ ان کی زندگی اکثر قید خانوں میں گذری اور مصائب و آلام کا شکار رہی۔ وہ گمنامی کی زندگی جئے یا بدنامی کی موت مرے۔ لیکن مرنے کے بعد آنے والے زمانے نے ان چیتھڑوں، گدڑیوں تک کو ڈھونڈھ کر نکالا جن میں انہوں نے زندگی کے دن کاٹے تھے اور انہیں اپنے عجائب گھروں کی یادگار اور پرستش گاہوں کی زینت بنایا۔ ان کا ایک ایک لفظ سونے کے حروف میں لکھا اور جواہرات کے ترازوؤں میں تولا گیا۔

قرآنی انقلاب کی بلند سطح

ان حقائق کی روشنی میں سلیم! ذرا اس زمانے کی علمی، ذہنی، فکری، معاشی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور عمرانی سطح پر غور کرو جس میں قرآن آیا۔ اور اس کے بعد اس انقلاب آفریں پیغام کو دیکھو جو قرآن لایا تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ پیغام اس زمانے کی سطح سے کس قدر اونچا اور اُس دَور سے کتنا آگے تھا۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جس زمانے میں دنیا کی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے مفکرین سے لے کر عام انسانوں تک، مندروں اور قربان گاہوں، معبدوں اور خانقاہوں کی پُراسرار اچھوتہ پرستیوں کے شکار اور راہبوں، پجاریوں، پنڈتوں اور کاہنوں کے دامِ تزویر کے اسیر تھے اور انہیں کاروبارِ خداوندی کے براہِ راست کارپرداز تصور

کرتے تھے۔ اُس زمانے میں یہ آواز کہ انسان اور خدا کے درمیان کوئی تیسری طاقت حائل نہیں کس قدر زمانے کی سطح سے اونچی تھی؟

جس زمانے میں ساری دنیا کا معمول یہ تھا کہ وہ راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور شاہنشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھتی اور ان کی اسی نہج پر پرستش کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ پکار کہ کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اور یہ کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں، اُس دور کے کان کے لئے کس قدر نامانوس اور اس زمانے کے قلب کے لئے کیسی نامانوس تھی۔

جس زمانے میں عزت کا معیار نسلی تفوق، شرف و مجد کا معیار خاندانی اور قبائلی نسبتیں، اور قیادت و سیادت کا مدار حسب و نسب پر سمجھا اور مانا جاتا ہو اور ان امتیازات کے استحکام و بقا کے لئے ملکوں کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ و برباد کر دی جائیں اور ایسا کرنے میں ہر شخص، ہر قبیلہ، ہر ملک اور ہر قوم انتہائی فخر محسوس کرے اُس زمانے میں یہ پیغام کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے اعتبار سے ایک جیسا ہے اور عزت و تکریم کا معیار اس کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ آبائی نسبتیں، کس قدر اجنبی اور "غیر فطری" تھا!

جس دور میں انسانوں کی تقسیم ملکوں کی چار دیواریوں اور قوموں کی حدبندیوں کی رُو سے ہوتی تھی اور وطن اور قوم کی خاطر جان دینا زندگی کا مقدس ترین فرض سمجھا جاتا تھا۔ اُس دور میں یہ دعوت کہ انسانوں کی تقسیم اور قوموں کی تشکیل، وطن، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اشتراک سے نہیں بلکہ آئیڈیالوجی کی رُو سے ہوتی ہے کس قدر ناقابلِ فہم اور "ماورائے سرحدِ ادراک" تھی!

جس زمانے میں حالت یہ تھی کہ انسان نے، فطرت کے ہر حادثہ اور کائنات کے ہر تغیر کے لئے ایک ایک الگ "خدا" تجویز کر رکھا تھا جس کی خوشنودی اور ناراضگی ہر خوش آئند یا الم انگیز واقعہ کا موجب بنتی تھی، اس زمانے کے انسان سے یہ کہنا کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے ایک لگے بندھے قانون کے تابع ہوتا ہے۔ یہاں ہر معلول (EFFECT) کے لئے ایک علت (CAUSE) اور ہر سبب کے لئے ایک مسبب ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک غیر متبدل قاعدے کے مطابق ہوتا ہے جس میں کبھی کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتی، کتنا محیر العقول تصور اور کیسا ناقابلِ تسلیم دعوٰے تھا۔

جس زمانے میں انسان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اپنے ذہن کی تراشیدہ موہوم قوتوں کے سامنے بے دست و پا سمجھ کر اپنے آپ کو قدم قدم پر مجبور و مقہور پاتا تھا، اُس زمانے میں انسان سے یہ کہنا کہ ان موہوم قوتوں کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کی تمام موجود قوتیں اس کے لئے تابع فرمان کر دی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنا کام لے۔ یہ ایک ایسی آواز تھی جس پر کوئی کان دھرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

جس زمانے میں انسان کی علمی سطح کا یہ عالم تھا کہ گاؤں میں جو شخص دس سے اوپر گنتی جانتا تھا اسے مافوق البشر تصور کیا جاتا تھا اس زمانے میں اور تو اور، خود پیغمبر کے متعلق یہ اعلان کہ وہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے، انسان کے ذہن میں سمانے والی بات ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

جس زمانے میں یہ ایک مسلمہ تھا کہ مقدس بزرگ وہ ہے جس سے کوئی نہ کوئی شعبدہ سرزد ہو، اس زمانے میں یہ کہنا کہ ہم نے پیغمبر تک

کو بھی کوئی حسّی معجزہ نہیں دیا اور کسی دعوے کے جھوٹے اور سچے ہونے کا معیار یہ ہے کہ علم و بصیرت اس کے متعلق کیا کہتے ہیں اور اس کے ماننے اور نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، ایک ایسی بات تھی جسے "عقل" تسلیم ہی نہیں کر سکتی تھی! پیغمبر اور معجزہ ہی کوئی نہیں! مذہب کی باتیں اور ان کا مدار عقل و بصیرت پر!! شریعت کی رسومات اور ان کی پرکھ' نتائج کی رُو سے!!! لسے اگر وہ بوالعجبی قرار نہ دیتے تو اور کیا کہتے؟

جس زمانے میں مزدور (LABOURER) تو ایک طرف' غلام (SLAVE) تک کو فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہو' اس زمانے میں یہ آواز اٹھانا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کا مالک بن بیٹھے،" پاگل پن" کی بات نہیں تو اور کیا قرار پاتی؟

اور جس زمانے میں قارون کی سی دولت کو خدا کا فضل قرار دیا جاتا ہو. زمینداری اور جاگیرداری کو فطرت کا عطیہ ٹھہرایا جاتا ہو اور ذاتی املاک و مقبوضات پر کسی قسم کی حدبندی خلاف قانون و شریعت قرار پاتی ہو' اس زمانے میں یہ نعرہ بلند کرنا کہ دولت جمع کرنا بدترین جُرم ہے. ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی. رزق کے دروازے تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں. ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا اور اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما، معاشرہ کا بنیادی فریضہ ہے. کس قدر تحیّر انگیز آواز ہوگی۔

ذرا غور کرو سلیم! کہ چھٹی صدی عیسوی میں اس قسم کے تصوراتِ حیات اور اس انداز کے نظریاتِ زندگی اُس وقت کے ذہنِ انسانی کے لئے کس قدر نامانوس تھے. یہ وہ انقلاب آفریں تصورات تھے جنھیں اپنانے کے لئے زمانہ ابھی تیار ہی نہیں تھا. دنیا ان سے ابھی بہت پیچھے تھی. وہ تو خیر پھر بھی چھٹی صدی عیسوی تھی جسے ازمنۂ مظلمہ (DARK AGES) کہتے ہیں. قرآن کے انقلابی تصورات کا تو یہ عالم ہے کہ خود ہمارا زمانہ' یہ بیسویں صدی جسے تہذیب و تمدن اور علم و عقل کا بلند ترین مظہر سمجھا جاتا ہے، یہ بھی اس کے کئی ایک تصورات سے ہنوز بہت پیچھے ہے. ان تصورات کی سطح اتنی بلند ہے کہ ابھی زمانہ کو معلوم ان تک پہونچنے کے لئے کتنی منزلیں اور طے کرنی پڑیں. ان حالات میں تعجب انگیز بات یہ نہیں کہ قرآن کا پیش کردہ نظام (تمہارے خیال کے مطابق) زیادہ عرصہ تک چلا کیوں نہیں. تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس زمانے میں اتنے لوگ کس طرح پیدا ہو گئے جنھوں نے اپنے زمانے کی سطح سے اتنے بلند اور نامانوس تصورات کو اپنا لیا اور انھیں عملاً متشکل کر دیا. سلیم! جب میں اس مسئلہ کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں تو اس ذاتِ اقدس و اعظم کی تحیّر انگیز تعلیم و تربیت کے حسنِ تصوّر سے میری روح وجد میں آجاتی ہے جس نے اس دور میں ایسے افراد تیار کر لئے جنھوں نے اس قسم کے نظام کو اپنا کر دکھایا. میرے نزدیک حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی ہے کہ جن حالات میں دنیا کا ہر نابغہ (GENIUS) اپنے زمانہ کی قدر ناشناسی کا رونا رو کر اور اپنے آپ کو "آنے والے زمانے کا انسان" کہہ کر چلا جائے حضورؐ ان حالات میں یہ کہیں کہ خیر القرون قرنی. سب سے بہتر میرا زمانہ ہے. جس میں اس قسم کا انقلاب آفریں نظام، جو زمانہ کی سطح سے بہت بلند و بالا ہے، اس حسن و خوبی سے متشکل ہو کر سامنے آگیا ہے. اگر تم سلیم! اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھو تو حضور نبی اکرمؐ، تمام دنیا کے انقلابی قائدین میں سب سے آگے اور سب سے اُونچے نظر آئیں گے. ذرا سوچو! کہ ان تصورات کو جن تک زمانہ تیرہ سو سال میں بھی کما حقہ نہیں پہنچ سکا، نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ذہن نشین کرانا بلکہ انھیں ان کے ہاتھوں سے عملاً متشکل کرا دینا، اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ کتاب و حکمت

حیرت انگیز انقلاب

کی ایسی حقیقت کشا اور محیر العقول تعلیم اور انسانی صلاحیتوں کا اس قدر ناقابلِ تصور تزکیہ (نشوونما) اسی قسم کے معلّم و مُربّی کے ہاتھوں عمل میں آسکتا تھا۔ یہی تھا حضورؐ کا وہ عدیم النظیر کارنامہ جس پر خدا اور کائنات کی تمام تعمیری قوتیں، غلغلہ ہائے تبریک و تحسین بلند کرتی تھیں۔

محیر العقول معاشرہ

(اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ۳۳/۵۶) اور حضورؐ کے ساتھ اس جماعتِ مومنین کے لئے بھی، جو ساری دنیا سے الگ ہٹ کر اور اپنے زمانے کی سطح سے بلند ہو کر اس قسم کے ناممکن التصور نظام کو عملاً متشکل کر رہے تھے۔ (ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ ۳۳/۴۳) سوچو سلیم! اُس زمانے میں (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) قریش کے مرکزِ مکہ کے اندر اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار اور عجم (فارس) کا ایک "عالی" (سلمانؓ) روم کا ایک مزدور (صہیبؓ) اور حبش کا ایک غلام (بلالؓ) نہ صرف ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے تھے بلکہ باہمی رشتے ناطے بھی کرتے تھے، کس قدر محیر العقول تھا۔ پھر اس معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا کر دینا کہ اور تو اور خود رسول اللہ جب کسی غلام اور لونڈی سے بھی کوئی بات کہتے تو وہ بغیر کسی جھجک کے پوچھ لیتے کہ حضورؐ آپ ایسا دحی کی رُو سے فرماتے ہیں یا یہ آپ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اور جب آپ فرماتے کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو وہ نہایت آزادی سے کہہ دیتے کہ معاف فرمائیے! اس باب میں میرا فیصلہ کچھ اور ہے، اس لئے میں اس مشورہ کو نہیں مان سکتا۔ کتنا بڑا تھا یہ انقلاب جو ذہنیتوں میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ امورِ مملکت میں ایسا نقشہ پیدا کر دینا کہ اگر کسی دوسرے کی رائے زیادہ بہتر ہے تو امیرِ مملکت (نبی اکرمؐ) اسے خود اپنی رائے پر ترجیح دیتے اور بڑے سے بڑے اہم معاملات کو باہمی مشاورت سے طے کرتے، کتنی بڑی تبدیلی کا آئینہ دار تھا۔ اس سے بھی آگے بڑھو تو رسول اللہؐ کی وفات پر حضرت صدیق اکبرؓ کا پورے مجمع سے یہ کہنا کہ جو شخص محمدؐ کی پرستش کرتا تھا، وہ سمجھ لے کہ اس کا خدا مر گیا ہے۔ لیکن جو خدائے حی و قیوم کا پرستار ہے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا خدا زندہ و پائندہ ہے۔ محمدؐ خدا کے ایک رسول تھے۔ وہ اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے تشریف لے گئے ہیں۔ اس سے اس نظام پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ جسے حضورؐ نے قائم کیا تھا۔ سوچو سلیم! کہ یہ آواز اس زمانے میں کتنی قبل از وقت تھی۔ پھر حضورؐ کی وفات پر لوگوں کا جمع ہو کر اپنے میں سے ایک امیر چن لینا اور بلا لحاظ قرابت و وراثت سب کا اسے امیر تسلیم کرنا اس دور کے ذہنِ انسانی کے لئے کس قدر نامانوس واقعہ تھا! اور خود رسول اللہؐ کا یہ اعلان کہ میرے گھر میں ایک پیسہ بھی جمع نہیں۔ اور جو اشیائے مستعملہ میں چھوڑ رہا ہوں، اس کا کوئی وارث نہیں۔ وہ تمام امت کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ اس زمانے کے لئے کس قدر تحیر انگیز تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا، بہ حیثیت امیر المومنین، صرف اتنا کفاف (روزینہ) لینا جتنی ایک مزدور کی اُجرت ہوتی ہے، اور اپنی وفات کے وقت اس رقم کو بھی بیت المال میں یہ کہہ کر واپس داخل کر دینا کہ معلوم نہیں میں اس رقم کے برابر کام بھی کر سکا ہوں یا نہیں، اس زمانہ کی سطح سے کس قدر اونچا فیصلہ تھا! حضرت عمرؓ کا اپنی بیوی سے یہ کہنا کہ قیصر کی بیوی نے (تمہارے عطر کے تحفہ کے بدلے میں) جو جواہرات بھیجے ہیں وہ بہ حیثیت امیر المومنین کی بیوی کے بھیجے ہیں نہ کہ تمہاری ذاتی حیثیت سے اس لئے انہیں بیت المال میں داخل کرنا چاہیئے! اس زمانے کی فضا میں کس قدر تعجب انگیز سی بات تھی! اور ان کا یہ فیصلہ کہ مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ملت کی مشترکہ تحویل میں رہنی چاہئیں۔ تاکہ اس سے موجودہ اور آئندہ نسلیں یکساں طور پر فائدہ اٹھائیں۔ اس دور کے لوگوں کے لئے کس قدر حیرت

افرد تھا! پھر دادی شام کی اس بڑھیا کا یہ کہنا کہ اگر خلیفۃ المسلمین، امت کے تمام افراد کے حالات سے باخبر رہنے اور ان کی ضرورت کو از خود پورا کرنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے خلافت کو چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہیئے کیونکہ وہ اس کا اہل نہیں، اس زمانے کے لئے کس قدر ناقابلِ تصور تھا۔ اور حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ کہ میں گیہوں کی روٹی اس وقت کھاؤں گا جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی میسر آ رہی ہے ورنہ میں جَو کی روٹی ہی کھاؤں گا۔ اس زمانے کے آسمان کی آنکھ کے لئے کیسا تحیر انگیز تھا؟ سوچو سلیم! کہ اس زمانے میں اس قسم کا معاشرہ قائم کر دینا جس میں اس قسم کے فیصلے بے تکلف نہ کئے جائیں بلکہ زندگی کا عام معمول بن کر از خود سامنے آتے جائیں، کس قدر قبل از وقت تھا؟ (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، ذہنِ انسانی تو تیرہ صدیاں آگے بڑھنے پر بھی اس سطح تک نہیں پہنچا کہ وہ ان تصورات کو اپنا کر زندگی کا معمول بنا لے۔ لہٰذا اس زمانے میں اس قسم کا نقشہ پیدا کر دینا کتنی بڑی کامیابی تھی۔

اس مقام پر اس غلط فہمی کو رفع کر لینا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کہا ہے کہ انقلابی دعوت اُس زمانے کے عام ذہنِ انسانی سے

ذہنِ انسانی کو بلند کیا جا سکتا ہے

بہت اونچی سطح پر ہوتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس دَور کا انسانی ذہن اس دعوت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ وہ دعوت سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن (جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں) اس کے لئے خاص جد و جہد کی ضرورت ہوتی ہے، اور انسانی ذہن بڑا سہل انگار واقع ہوا ہے۔ یہ محنت اور کاوش سے جی چراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقلید کی روش (جس میں انسان کو کچھ سوچنا ہی نہیں پڑتا، بلکہ اس میں سوچنا حرام سمجھا جاتا ہے)۔ بڑی آسانی سے خود بخود آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ محنت اور کاوش سے ہر دور کے انسانی ذہن کی سطح بلند ہو سکتی ہے۔ اسلام کے قرنِ اوّل کی تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ اس قسم کے ہنگامی انقلابات سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ اگر خاص جد و جہد اور کد و کاوش سے کچھ وقت کے لئے ابدی قوانین کی رفتار تیز کر کے ان کے نتائج غیر معمولی طور پر نمودار کر لئے جائیں اور اس کے بعد انسانی ذہن اور اس کا معاشرہ

ہنگامی انقلاب سے فائدہ کیا؟

پھر اُسی سطح پر چلا جائے، تو عالمِ انسانیت کو اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ متعین شکل میں اس سوال کا مطلب یہ ہو گا کہ قرنِ اول کے اسلام نے دنیائے انسانیت کو کیا دیا؟

اس نے دنیائے انسانیت کو بہت کچھ دیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ خدا کے ابدی قوانین و حقائق ایک مدون کتابی شکل (قرآن) میں دنیا کے سامنے آ گئے کہ جس کا جی چاہے انہیں عملی پیکر میں لا کر ان کے خوشگوار نتائج حاصل کرے۔

دوسرے یہ کہ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ قوانین ایسے ہیں جن پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ محض شاعر کا خواب" (Utopia) نہیں ایک ممکن العمل (Practicable) ضابطہ حیات ہے جس پر تاریخ کے ایک دَور میں عمل کیا گیا تھا۔ اور اس کے نتائج سامنے آ گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انقلابی دَور، زمانے کی امامت کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، عقل کا طریق کار تجرباتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔ اس پر عمل کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا اس لئے تجربہ ناکام رہا۔ اس کے بعد عقل کسی دوسرے نظریہ پر تجربہ شروع کر دیتی ہے۔ لیکن اگر کسی انقلابی دَور کے نتائج اس کے سامنے ہوں تو اسے

اپنے تجربہ کے متعلق صحیح نتیجہ تک پہونچ جانے کے لئے زیادہ وقت درکار نہیں ہوتا۔ تم سلیم، زمانۂ قبل از اسلام کی انسانی تاریخ، اور زمانہ بعد از اسلام کی تاریخ پر نظر ڈالو اور پھر دیکھو کہ دنیائے جس تیزی سے زمانہ بعد از اسلام میں ترقی کی ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اور یہ بھی اس صورت میں ہوا ہے جب کہ اسلام کے قرنِ اول کی صحیح اور خالص تاریخ دنیا کے سامنے نہیں۔ اگر اُس دور کی غیر مخلوط تاریخ دنیا کے سامنے ہوتی تو تم دیکھتے کہ آج دنیا کا نقشہ کیا ہوتا؟ یوں سمجھو کہ اس قسم کا انقلابی دَور، زمانے کی گاڑی کو ایسا دھکا (Push) دیدیتا ہے جس سے اس کی رفتار میں خاصی تیزی آجاتی ہے اور کتنا ہی فاصلہ وہ محض اپنے زورِ دوروں (Momentum) سے طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ اُسی زور دروں کا اثر تھا کہ، اگرچہ صحیح اسلامی معاشرہ کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا، لیکن مسلمان (اس کے بعد بھی) صدیوں تک دنیائے علم و فن میں اقوامِ عالم کی امامت کرتے رہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور مؤرخین تک نے کیا ہے۔ مثلاً رابرٹ بریفالٹ (Briffault) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب The Making of Humanity میں ایک خاص باب اس موضوع کے لئے وقف کیا ہے۔

اسلام نے دنیا کو کیا دیا؟

یورپ کو مہذب اسلام نے بنایا۔

اور اس کا نام ہی اس نے "دارالحکمت" رکھا ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے کہ

> یورپ کو حیاتِ نو پندرھویں صدی میں نہیں ملی۔ یہ اُسے عرب اور اندلسی مسلمانوں کے کلچر کے اثرات سے ملی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ اٹلی نہیں بلکہ ہسپانیہ تھا۔ جب یورپ آہستہ آہستہ، وحشت اور بربریت کے انتہائی پست نقطہ تک پہونچ چکا تھا تو اس وقت بغداد، قاہرہ، قرطبہ، ٹالیدو، نئی تہذیب اور تازہ افکار کے مراکز بن رہے تھے۔ یہی وہ مراکز تھے جن سے دنیا کو وہ نئی زندگی عطا ہوئی۔ جس نے ارتقائے انسانیت کی ایک جدید منزل بننا تھا۔ جب مسلمانوں کی نئی ثقافت محسوس شکل میں سامنے آئی تو دنیا میں حیاتِ تازہ کی نمود شروع ہوئی..... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کو کبھی تہذیب کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ (ص ۱۸۹-۹۰)

یہ ہے جو کچھ دنیا کو اسلام کے انقلابی دَور کے دھکے سے ملا۔

اب چوتھی شق کو سامنے لاؤ۔ یعنی یہ سوال کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ اسلام کے ابدی حقائق اپنی معمولی رفتار سے آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں، کسی جگہ رک کر کھڑے نہیں ہو گئے۔ اس کے لئے سلیم! پہلے اُس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا جب قرآن نازل ہوا۔ اور اس کے بعد اس تیرہ سو سالہ انسانی تاریخ کا مطالعہ۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس تیرہ سو سال میں انسان، مختلف تجارب کے بعد، اُن تصورات کو اختیار کرتا چلا آرہا ہے جو قرآن نے دیئے تھے، یا اُن تصورات کی طرف جا رہا ہے جو قرآن سے پہلے دنیا میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔

اس کا ثبوت کہ اسلام آگے چل رہا ہے

دنیا کے فیصلے

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق نظامِ جہاں بانی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور یہ تصور دیا کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ اُس وقت ذہن کے لئے یہ تصور نامانوس تھا تم بتاؤ کہ اس کے بعد اس تیرہ سو سال میں، ذہنِ انسانی کا رُخ ملوکیت کی سمت رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ "اسلام قبول کرتا" چلا گیا ہے اور قبول کرتا چلا جا رہا ہے؟

انسانی ذہن کا اُس وقت فیصلہ یہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزو لاینفک ہے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ ہے اس لئے اس نظام کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام افرادِ انسانیہ اپنی پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس لئے کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنا لینا یکسر خلافِ انسانیت ہے۔ اس وقت کے ذہنِ انسانی کی عام سطح نے اس تصور کو نا قابلِ قبول سمجھا۔ لیکن بتاؤ کہ اس کے بعد زمانے نے اس تصور کو قابلِ قبول سمجھا یا اپنے قدیمی تصور کو؟

ذہنِ انسانی کا اس وقت کا فیصلہ تھا کہ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر، ایک قوم کو دوسری قوم پر یعنی ایک نسل کو دوسری نسل پر فوقیت حاصل ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہرِ ذاتی سے ہے نہ کہ انتسابِ نسبی سے۔ اس زمانہ نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا۔ لیکن تم غور کرو کہ اس زمانے کے بعد زمانہ نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا؟ کیا وہی نہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا؟

اُس زمانہ میں ذہنِ انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں اس لئے ہیرو ورشپ (مشاہیر پرستی) عین تقاضائے فطرت ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ تصور ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیت کی یادگار ہے۔ اب قومیں آئیڈیالوجی کی بنیاد پر مرتب ہوں گی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔ اُس زمانے نے اس تصور کو اپنے لئے ناآشنا پایا اس لئے رد کر دیا۔ لیکن تم بتاؤ کہ آج تمہارے زمانہ کا رجحان کیا اس رد کردہ تصور کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے؟

اُس زمانے میں جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابقِ فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز تصور پیش کیا کہ ہر فردِ انسانی کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشوونما ہے۔ اس لئے وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے۔ زمین پر سانپ کی طرح بیٹھ جانا اور چاندی اور سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرتے چلے جانا انسانیت کی عدالت میں بدترین جُرم ہے جس کی سزا تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اُس زمانے نے اس تصور کو ٹھکرا دیا لیکن ذرا غور کرو سلیم! کیا زمانہ اسی ٹھکرائے ہوئے تصور کو اپنانے کے لئے مضطرب و بے چین نہیں ہے؟

اُس زمانے میں مختلف خاندانوں، قبیلوں، قوموں کا تو تصور تھا لیکن عالمگیر انسانیت کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ قرآن نے آکر کہا کہ تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری ہے اور اس کی عملی تشکیل اس طرح ہو سکتی ہے کہ تمام دُنیا کا نظامِ حکومت ایک ہو۔ یہ بات اُس زمانے کے عام ذہن میں نہ آئی۔ لیکن ذرا غور کرو سلیم! کہ اس کے بعد دنیا کا رخ عالمگیر انسانیت کی منزل کی طرف ہے یا انسانوں

تو مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کی طرف ؟ آج دنیا نیشنلزم کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہے اس کی تفصیل معلوم کرنی چاہو تو (میری کتاب) "انسان نے کیا سوچا؟" میں سیاسیات سے متعلق باب پڑھو، حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی۔ نیشنلزم کے بعد، مغربی مفکرین نے انٹرنیشنلزم (بین الاقوامیت) کی طرف رخ کیا۔ لیکن چند ہی قدم چلنے کے بعد انھوں نے محسوس کر لیا کہ یہ راستہ بھی انھیں انسانیت کی صحیح منزل کی طرف نہیں لے جا سکتا۔ چنانچہ اب وہ اسے چھوڑ کر عالمگیر انسانیت (Universealism) اور تمام دنیا میں واحد حکومت (One World Government) کے تصورات کی طرف آرہے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انھیں کوئی بنیاد نہیں ملتی جس پر اس کی عمارت استوار کریں (یہ بنیاد قرآن کی عطا کردہ مستقل اقدار کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی)۔

میں نے یہ چند باتیں سلیم بحض بطور مثال لکھدی ہیں ورنہ زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس میں انسان اپنے ناکام تجارب کے بعد، اس راستہ پر چل نہیں پڑا یا اس راستے کی تلاش میں نہیں، جسے قرآن نے کاروانِ انسانیت کو منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والا راستہ بتایا ہے۔ زمانہ قرآن کے انقلاب آفریں حقائق میں سے بعض کو اپنا چکا ہے، بعض کو اپنانے کے لئے مضطرب و بیقرار ہے۔ اور جو حقائق باقی ہیں وہ اس زمانے کی سطح سے بھی اونچے ہیں۔ یہ اس لئے کہ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے آخری اور مکمل راہ نمائی ہے، لہٰذا اس کے حقائق زمانے کی لہروں کے ساتھ ساتھ کھلتے جائیں گے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھاتے جائیں گے تا آنکہ یہ بات ابھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ زمانہ انفس و آفاق کی ان نشانیوں کو دیکھ کر قرآن کے ابدی حقائق کو اپنائے اور اس طرح رفتہ رفتہ "مسلمان ہوتے" چلا جا رہا ہے۔

جو کچھ شروع میں کہا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں پھر سن لو کہ

نگہ بازگشت

(۱) اسلام مجموعہ ہے ان ابدی حقائق، غیر متبدل قوانین اور مستقل اقدار کا جنھیں نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے بذریعہ وحی عطا کیا ہے اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔

(۲) اسلام اپنی آفاقی رفتار سے (جو ہمارے حساب و شمار کے مطابق بہت سست ہوتی ہے) چلا آرہا تھا اور اس طرح عام ارتقائی طریق سے (By Evolution) اپنے حقائق کو آہستہ آہستہ انسانی معاشرہ کا جزو بنا رہا تھا کہ نبی اکرمؐ کا ظہور ہوا۔

(۳) نبی اکرمؐ نے برسوں کی سعیِ پیہم سے، ایک جماعت تیار کی جس کے عملی پروگرام سے اسلام کے حقائق کی آفاقی رفتار میں بڑی تیزی آگئی اور ان کے نتائج، انسانی حساب و شمار کے مطابق، محسوس شکل میں سامنے آگئے۔ یہ ہے وہ دور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک کامیاب تجربہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔

(۴) کچھ عرصہ کے بعد، وہ طریقِ کار (یعنی دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت اور تعلیم کتاب و حکمت) جسے نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا

باقی نہ رہا۔ اس طرح وہ خارجی قوت جس نے اسلام کے ابدی قوانین کی رفتار میں اس قدر محیّر العقول تیزی پیدا کر دی تھی، ختم ہو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ (آفاقی دسعت) رفتار سے آگے چلنے لگ گیا۔ اس سے سطح بیں لوگ اس نتیجہ پر پہونچ جاتے ہیں کہ اسلام تھوڑی دور چل کر ناکام رہ گیا۔

ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام اور مسلمان قوم کو ایک ہی تصوّر کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی سے اس نتیجہ پر پہونچ جاتے ہیں کہ اسلام دنیا میں ناکام رہا ہے۔ وہ چند قدم چل کر رک گیا اور زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ اگر ہم اسلام

اسلام اور مُسلمان قوم کا فرق

اور مسلمان قوم کے فرق کو سمجھ لیں تو پھر اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اسلام کے حقائق کی نمود تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہی ہو گئی تھی اور انھوں نے رفتہ رفتہ آگے بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے میں مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام نے انھیں اپنایا تو انھیں سرفرازیاں اور خوشگواریاں نصیب ہو گئیں۔ جب انھوں نے ان حقائق کا ساتھ چھوڑ دیا تو (باقی اقوام کی طرح) مصیبتوں کا شکار ہو گئیں۔ آج سے قریب چودہ سو سال پہلے سرزمین عرب کی ایک قوم نے ان حقائق کو اپنایا تو اسے محیّر العقول ترقی نصیب ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نے انہیں چھوڑ دیا تو اس پر زوال آ گیا۔ لیکن اسلام بدستور آگے چلتا رہا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اسلام کس طرح خراماں خراماں آگے بڑھتا اور زمانہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ نوعِ انسان کی تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ ہر وہ نظام جسے ذہنِ انسانی نے وضع کیا، چند دنوں تک زندہ رہ کر ناکام ثابت ہو گیا۔ اور آگے صرف اسلام

اسلام کی تاریخ کے شواہد

بڑھا۔ جب فرانس کے گلی کوچوں میں، ملوکیت کو مٹا کر جمہوری نظام کی طرح ڈالنے کے لئے انقلاب برپا کیا گیا تھا، تو وہ بھی اسلام کی تاریخ کی ایک کڑی تھی۔ اور جب امریکہ میں غلامی کے انسداد کے لئے لڑائیاں لڑی گئیں تو وہ بھی اسلام ہی کی زرّیں داستان کا ایک باب تھا۔ جب ہندوستان میں اچھوتوں کو "ہری جن" (درِ درجہ خداوندی کے حامل) قرار دیئے جانے کی تحریک اٹھی تو وہ بھی اسلام ہی کی ایک ابدی حقیقت کی نمود تھی۔ اور اب جو امریکہ میں سیاہ اور سفید فام افراد میں تمیز رنگ و نسل مٹانے کی جدوجہد ہو رہی ہے تو یہ بھی اسلام ہی کی طرف ایک قدم اٹھ رہا ہے۔ جب اقوامِ عالم نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مختلف قوموں کے تنازعات کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیا جائے تو وہ بھی اسلام کی پیش کردہ تجویز پر عمل درآمد کی صورت تھی۔ اور اب جو ذہنِ انسانی میں یہ خیال انگڑائیاں لے رہا ہے کہ دنیا سے اسلحہ کا وجود ختم کر دیا جائے تو یہ بھی اسلام ہی کے پروگرام کی ایک کڑی ہے جس نے چودہ سو سال پیشتر کہا تھا کہ جنگ کی اس وقت تک ضرورت ہے جب تک جنگ خود اپنے ہتھیار نہ رکھ دے۔ غرضیکہ اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں جہاں جہاں کوئی تحریک نوعِ انسانی کو صحیح آزادی اور ترقی کی طرف لے جانے کے لئے اٹھی ہے وہ قرآن ہی کی شمعِ نورانی کی ایک کرن تھی۔ اور جہاں جہاں انسانوں کے خودساختہ نظام ہائے حیات ناکام ثابت ہوئے ہیں وہ اسلام کے ابدی قوانین کی صداقت کا ثبوت تھا۔ تم اگر اس نگاہ سے دیکھو (سلیم!) تو یہ حقیقت واضح طور پر تمہارے سامنے آ جائے گی کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی تلاش پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو ۔۔۔ زانکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰؐ اورا بہاست　　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

تاریخِ انسانیت کا اس انداز سے مطالعہ کرنے سے تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لوگے کہ (نہ صرف یہ کہ) اسلام کسی مقام پر رک نہیں گیا، بلکہ یہ بھی کہ

اسلام ہی آگے بڑھ رہا ہے

اسلام کے سوا کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی مقام پر جا کر ناکام نہ ثابت ہو گیا ہو اور اس کی جگہ اسلام کے اصول نے نہ لے لی ہو۔ قرآن نے جب اسلام کے متعلق کہا تھا کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) ـــــ کہ یہ نظامِ خداوندی، تمام انسانی نظام ہائے زندگی پر غالب آئے گا ـــــ تو یہ ایک حقیقت کا بیان تھا۔ قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان کا مستقبل روشن ہے۔ جب (تخلیقِ آدم کے سلسلہ میں) ملائکہ نے خدا سے کہا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) ـــــ کہ یہ دنیا میں فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں کرے گا ـــــ تو اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ اِنِّىْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۰) ـــــ میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ـــــ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی آخری منزل، جس میں یہ صحیح مقامِ آدمیت پر پہنچے گا، وہ ہوگی جس میں فساد انگیزیوں اور خوں ریزیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) کا دور دورہ ہوگا۔ انسان کو اس منزل کی طرف اسلام لئے جا رہا ہے اور یہ اسے وہاں تک پہنچا کر رہے گا۔ اس لئے کہ یہ خدائے "رب العالمین" کا تجویز کردہ نظام ہے اور ربّ کہتے ہی اسے ہیں جو کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے، بتدریج، نقطۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ اگر خدا کا تجویز کردہ نظام آخری منزل تک نہ پہنچے، راستے ہی میں رک جائے تو وہ خدا، ربّ العالمین نہیں ہو سکتا۔ دنیا اس پروگرام کے مختلف اجزاء کو ایک ایک کر کے اپنا رہی ہے۔ لیکن ان الگ الگ اجزاء سے قرآنی نظام کے نتائجِ کلی مرتب نہیں ہو سکتے۔ نظام ایک غیر منقسم وحدت ہوتا ہے جو اسی صورت میں اپنے نتائج مرتب کرتا ہے جب اسے بالکلیہ (AS A WHOLE) اختیار کیا جائے۔ (جس طرح دوائی کا نسخہ اسی صورت میں اپنے صحیح نتائج پیدا کر سکتا ہے جب اس کے تمام اجزاء صحیح اوزان کے ساتھ، جمع کر کے دوائی بنائی جائے) جو قوم اس نظام کو بالکلیہ اختیار کر لے اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے اور یہی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی مصداق قرار پا سکتی ہے۔ انسان نے آخر الامر اس مقام تک پہنچنا ہے خواہ یہ اپنے تجرباتی طریق سے پہنچے یا ایمان کی رو سے۔ ایمان کی رو سے یہ صدیوں کی مسافت لمحوں میں طے کرے گا اور ان تمام نقصانات سے بچ جائے گا جو تجرباتی طریق کا لازمی نتیجہ ہیں۔

اس مقام پر یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ یہ کیا وجہ ہے کہ دنیا کی باقی قومیں اس قدر آگے بڑھ رہی ہیں اور مسلمان ان سب سے پیچھے ہیں۔ اس کی تفصیلی وجوہات تو تمہیں "اسبابِ زوالِ امت" میں ملیں گی۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ دنیا کی دیگر اقوام "انفس و آفاق کی نشانیاں" پر غور و فکر کے بعد، قرآنی حقائق کو اپنائے جا رہی ہیں اور مسلمان اس عجمی اسلام کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جس کی رو سے سوچنا اور سمجھنا حرام ہے۔ لہٰذا یہ اقوامِ عالم میں سب سے پیچھے ہے۔ جس دن اس نے پھر سے "یتلوا علیھم اٰیاتہ" کا پروگرام اپنے سامنے رکھ لیا ـــــ یعنی قرآنِ خالص کو اپنا نصب العین بنا لیا ـــــ اقوامِ عالم کی امامت ان کے حصے میں آ جائے گی۔

———— ٭ ————

کہو سلیم! اب بھی تمہارا یہی خیال ہے کہ اسلام آگے نہیں چلا؟ اسے پھر سمجھ لو کہ (گوئٹے کی تشبیہ کے مطابق) اسلام ایک صاف اور شفاف ندی ہے جو رواں دواں اپنی منزل کی طرف بہے جا رہی ہے۔ جو قوم اس ندی کے پانی سے اپنی زمین سیراب کرے گی اس کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔ تاریخ کے ایک دور میں عرب کی قوم نے ایسا ہی کیا تو اسے "ایک ایک دانے کے عوض سو سو دانے ملے"۔ جب اس نے اس ندی سے پانی لینا بند کر دیا تو اس کی کھیتیاں سوکھ گئیں۔ سطح بیں نگاہوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ وہ ندی ہی سوکھ گئی۔ یہ غلط ہے۔ وہ ندی بدستور بہے جا رہی ہے جس کا جی چاہے اس سے اپنے کھیتوں کو سیراب کر لے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) تیرے نشوونما دینے والے کا ابرِ کرم، ہر ایک کو (اس کی سعی و عمل کے مطابق) سیرابیِ عطا کئے جا رہا ہے۔ اس کی یہ بخشش کبھی نہیں رکتی۔ جوئے رواں کی طرح جاری و ساری رہتی ہے۔

ہست ایں میکدہ دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

مسلمانوں کی کھیتیاں اس لئے سوکھ گئیں کہ انہوں نے اس آسمانی ندی سے آبیاری چھوڑ دی۔ ندی بدستور بہے جا رہی ہے۔ اگر سلیم! تمہارے ریڈیو سے نغمۂ نوبہار کی حیات بخش آواز آنی بند ہو گئی ہے تو تمہارے ریڈیو سیٹ میں نقص پیدا ہو گیا ہے۔ خدائی ریڈیو اسٹیشن سے بدستور پروگرام نشر ہو رہا ہے اور نشر ہوتا رہے گا ــــ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔

قرآن نے اسلامی نظام کی اس خصوصیتِ کبریٰ کو ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ (۱۴/۲۴) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے خوشگوار نظریۂ حیات کو (کس طرح) مثال دے کر سمجھایا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے بارآور درخت کی سی ہے جس کی جڑ بہت مضبوط ہو اور اس کی شاخیں بلند فضا میں پھیلی ہوئی ہوں۔ یعنی اس نظامِ زندگی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں پاتال تک پہنچی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے یہ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ حوادثِ زمانہ کی آندھیاں اور جھکڑ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ اپنی جگہ مضبوط اور محکم کھڑا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ کسی ایک ملک تک محدود نہیں (دوسرے مقام پر اس کے متعلق کہا ہے کہ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ (۲۴/۳۵) یہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند ہے)۔ اس کے بعد ہے تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۵)۔ قرآنی نظام کا یہ شجرِ طیب اپنے نشوونما دینے والے کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اپنا پھل ہر وقت دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ کسی خاص موسم (خاص زمانہ) میں اس نے پھل دیا اور اس کے بعد خشک ہو گیا۔ یہ ہمیشہ پھل دیتا ہے۔ یعنی یہ نظام جہاں مکان (SPACE) کی حدود سے ماورا ہے وہاں زمان (TIME) کی قیود سے بھی ناآشنا ہے۔

اس حقیقت کو سورۂ الرعد میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ جس جنت کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس کی مثال (اس باغ کی سی) ہے جس میں ہمیشہ پانی کی ندیاں

زوال ہوں اور اس کی وجہ سے اس کے درخت ہر وقت سرسبز و شاداب رہیں اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (۱۳/۳۵)۔ اس باغ کے پھل بھی ہمیشہ رہیں اور اس کا سایہ بھی۔

اب ظاہر ہے کہ جس شجرِ طیب کے متعلق خدا یہ کہتا ہو کہ وہ ہمیشہ پھل دیتا رہے گا اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے ایک زمانہ میں تو پھل دیا اور پھر خشک ہو گیا، حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) جس زمانہ کے متعلق سطح بین نگاہیں یہ کہتی ہیں کہ صرف اس میں شجرِ اسلام نے اپنا پھل دیا تھا، اس میں ہوا یہ تھا کہ مومنین کی جماعت نے اپنے حسنِ عمل کی آبیاری سے اس کی ثمرباری کی رفتار کو تیز کر دیا تھا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۴۸/۲۹) کی اس سعی و کاوش کے نتیجہ کو بھی قرآن نے کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے جہاں کہا ہے کہ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ۔ اس کھیتی کی طرح جو پہلے اپنی ننھی سی سوئی نکالتی ہے فَاٰزَرَهٗ پھر وہ اسے مضبوط کرتی ہے۔ فَاسْتَغْلَظَ۔ سو وہ موٹی ہو جاتی ہے۔ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ۔ پھر وہ اپنی نالوں پر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸/۲۹)۔ (اور اس طرح بارآور ہو کر) کسان کے دل کو خوش کرتی ہے تاکہ ان کی وجہ سے ان لوگوں کو غصہ میں لائے جو اس نظام کی صداقت کا انکار کرتے تھے۔ یعنی جس شجرِ طیب نے اپنی آفاقی رفتار سے دیر میں جا کر ثمر بار ہونا تھا، اس جماعت کی سعی و عمل سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے بارآور ہو گیا۔ جب انسانی دست و بازو کی یہ رفاقت ساتھ نہ رہی تو وہ درخت پھر اپنی معمولی رفتار سے بڑھنے، پھولنے اور پھلنے لگا۔

باقی رہی وہ جماعت جس نے اُس زمانے میں اس شجرِ طیب کے ثمرِ شیریں سے اس طرح جھولیاں بھر لی تھیں، تو اس کی یہ خوش حالی اُس نظام سے پیوستگی کا نتیجہ تھی۔ جب اس نے اس نظام کو چھوڑ دیا تو وہ اس نظام کے ثمرات سے بھی محروم ہو گئی۔ اس کے متعلق سورۂ ابراہیم کی اُس آیت کے تسلسل میں جسے اوپر درج کیا گیا ہے، قرآن نے کہا ہے کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ۔ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ۔ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۱۴/۲۷)۔ اللہ جماعتِ مومنین کی، دنیا اور آخرت میں جو جڑیں مضبوط کرتا ہے تو اُس نظریۂ زندگی کی رُو سے ایسا کرتا ہے جو خود محکم اور مضبوط ہے۔ جب تک وہ اس کے ساتھ پیوست رہتی ہے، ثابت اور مستحکم رہتی ہے جب اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے وہ نہ کسی کو یونہی ثبات و قرار عطا کرتا ہے نہ بلا سبب کسی کی جڑیں اکھیڑتا ہے۔ جس قسم کا نظام کوئی قوم اختیار کر لیتی ہے اسی قسم کا اس کا انجام ہوتا ہے۔ اسلام نہ کبھی ناکام ثابت ہوا ہے۔ نہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر نظام آخر الامر ناکام رہے گا۔ وَالْعَصْرِ۔ زمانہ (کی تاریخ) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِىْ خُسْرٍ۔ انسان (اپنے خود ساختہ نظامہائے حیات پر چلتے ہوئے) ہمیشہ نقصان میں رہے گا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ کامیاب ہمیشہ وہ جماعت رہے گی جو نظامِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھے اور اپنے اعمالِ صالحہ سے اس کی ثمرباری کی رفتار کو تیز کر دے)۔ لیکن یہ ہنگامی پروگرام نہیں کہ کسی ایک زمانے میں اس پر عمل پیرا ہو کر وہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے کامیاب و کامران رہے گی خواہ بعد میں اس نظام کو چھوڑ ہی کیوں نہ دے۔ بالکل نہیں۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳)

اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اس جماعت کے افراد ایک دوسرے کو اس نظام حق و صداقت کی تلقین کرتے رہیں۔ اور اس پر ثابت قدمی سے قائم رہنے کی تاکید کریں۔ جب تک مسلمان اس پروگرام پر عمل پیرا رہے، قوانینِ خداوندی کے نتائج حسنہ نے ان کی جھولیاں بھر دیں۔ جب انھوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ان کے ثمرات سے محروم ہو گئے۔

اور اس کے بعد وہ قوانین اپنی سابقہ رفتار سے آگے چلتے گئے۔ اور چلے جا رہے ہیں!

اسلام کے آگے چلنے کی ایک زندہ شہادت تو خود پاکستان کا وجود ہے۔ ہم ہزار برس سے "عجمی اسلام" کے زیر اثر یہ مانتے چلے آ رہے تھے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے۔ اسے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ بیس برس اُدھر یہاں یہ آواز بلند ہوئی کہ اسلام ایک معاشرتی نظام ہے جو ایک آزاد مملکت میں ہی قائم ہو سکتا ہے۔ اپنوں، بیگانوں سب نے اس تصور کی مخالفت کی لیکن آخر اسے کامیابی ہو کر رہی۔

تحریکِ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام میں قومیت 'دین' کی رُو سے تشکیل ہوتی ہے۔ وطن کی حدود کے اشتراک کی رُو سے نہیں۔ ساری دنیا نے اس تصور کی مخالفت کی۔ حتیٰ کہ عجمی اسلام کے علمبردار حضرات علمائے کرام نے بھی ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ دس برس تک یہ جنگ جاری رہی۔ اور آخر الامر ہر ایک کو اس تصور کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس طرح پاکستان وجود میں آگیا اور اس حقیقت کی زندہ دلیل بن گیا کہ خدا کے اٹل قوانین کی رُو سے 'قومیت' آئیڈیالوجی کے اشتراک سے متشکل ہوتی ہے۔ مغربی دنیا جو اپنے ہاں کی قومیت کے غیر قرآنی معیاروں سے بُری طرح تنگ آئی ہوئی ہے پاکستان کے تجربہ کو متجسّانہ نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔ تم دیکھو گے کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑ کر کس طرح قرآنی اصولوں کو اپنا لیتی ہے!

تشکیلِ پاکستان کے بعد، یہاں تدوینِ دستور کا سوال سامنے آیا۔ رجعت پسند عناصر اور عجمی اسلام کے علمبرداروں نے اس میں یہ شق رکھنی چاہی کہ قانون سازی کے ضمن میں امت کے نظامِ شورائیہ کے اوپر ایک "علماء بورڈ" ہونا چاہیئے جس کا فیصلہ حرفِ آخر ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، انھوں نے چاہا کہ یہاں اقتدارِ اعلیٰ "مذہبی پیشوائیت" کو حاصل ہو اور اس طرح تھیاکریسی کا وہ نظام قائم ہو جائے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ آئین اپنے آخری مراحل میں تھا کہ گورنر جنرل کے ایک فیصلے سے نہ وہ مجلسِ دستور ساز باقی رہی نہ اس کا مرتب کردہ دستور!

اس کے بعد یہ فریضہ دوسری مجلسِ دستور ساز کے سپرد ہوا۔ اس کا مرتب کردہ دستور، نقشِ اول سے قدرے بہتر تھا لیکن اس میں بھی غیر قرآنی عناصر کی کمی نہ تھی۔ اسی سے مذہبی پیشوائیت نے اسے "اسلامی دستور" قرار دے کر جشنِ مسرت کے شادیانے بجائے تھے۔ لیکن ابھی وہ دستور گھنٹیوں بھی چلنے نہ پایا تھا کہ عسکری انقلاب کے ایک جھکڑ نے اس کے پرخچے اُڑا دیئے۔

عسکری انقلاب کا پہلا قدم 'زرعی اصلاحات' تھا جس نے جاگیرداروں اور زمینداروں کے نظامِ کہن کی بنیادیں ہلا دیں۔ یہ نظام مسلمانوں کے دورِ ملوکیت میں پیدا ہوا تھا اور عجمی اثرات نے اس پر "عین اسلام" ہونے کی مہر ثبت کی تھی۔ ہماری مذہبی پیشوائیت ہزار برس سے اس کی حفاظت کرتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا؟ زرعی اصلاحات نے بڑی بڑی زمینداریوں کی تحدید سے قرآن کے اس عظیم اعلان کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچا دیا جس میں اس نے کہا تھا کہ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی

الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (۱۳/۴۱) کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ ہم (کس طرح) زمین کو اس کے بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے کم کرتے چلے جا رہے ہیں؟ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ. وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۳/۴۱)۔ اللہ (جو) فیصلے کرتا ہے انھیں رد کرنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جلد حساب لینے والا ہے: عسکری انقلاب کا یہ اقدام، قرآنی نظامِ معیشت کی طرف پہلا قدم ہے جس میں رزق کے سرچشمے، عالمگیر نشوونما کے لئے، اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں۔

تم سلیم! باقی ممالک کے عسکری انقلابات پر نگاہ ڈالو۔ وہ زمانۂ تاریک کی آہنی ڈکٹیٹرشپ کی یاد تازہ کر دیں گے۔ لیکن پاکستان میں وہی عسکری انقلاب جس تیزی سے ملک کو آئینی جمہوریت کی طرف لے جانے کی تدابیر کر رہا ہے، ایسی فضا کی نشان دہی کر رہا ہے جو قرآنی نظامِ شورائیہ کے لئے بڑی مساعد ہو سکتی ہے۔

ممکن ہے سلیم! ایک عام سیاسی مدبّر ان تبدیلیوں کے اسباب و عمل کچھ اور بتائے لیکن میری نگاہ تو مجھ سے صاف صاف کہہ رہی ہے کہ یہ سب کچھ خدا کے اسی کائناتی قانون کے مطابق ہو رہا ہے جو اپنی غیر محسوس، سست رفتاری سے کاروانِ انسانیت کو اس کی منزل کی طرف لے جا رہا ہے۔ اگر اس کے بعد سلیم! یہاں کا آئین قرآنی خطوط پر تشکل ہو گیا اور اس طرح یہاں قرآنی نظام قائم ہو گیا، تو خدا کے یہی قوانین، انسانی حساب و شمار سے اپنے نتائج مرتب کرنے شروع کر دیں گے۔ اس کے بعد تم دیکھنا کہ دنیا کس طرح جوق در جوق اس نظام کی طرف آتی ہے۔

لیکن اگر (خدانخواستہ) ایسا نہ ہوا اور ہم نے یہاں انسانوں کا خود ساختہ نظام رائج کر دیا، تو اسلام کے قوانین پھر اپنی آفاقی رفتار سے آگے بڑھیں گے اور نہ معلوم انسانیت کو انھیں اپنانے میں کتنا عرصہ اور لگ جائے گا۔ اس دوران میں جس قدر مزید خونریزیاں اور فساد انگیزیاں ہوں گی ان کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے۔ تم سوچو سلیم! کہ اس صورت میں ہم (مسلمانانِ پاکستان) انسانیت کی عدالت میں کس قدر سنگین جرم کے مرتکب قرار پائیں گے! لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ. اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ - (۱۶/۲۵)۔ ہماری پشت پر ہمارے جرائم کا بوجھ بھی ہوگا۔ اور ان لوگوں کے جرائم کے بوجھ کا بھی ایک حصہ جو ہماری وجہ سے گمراہ ہوں گے۔ کتنا بڑا ہوگا یہ بوجھ جو ہم اٹھائے ہوں گے!

بہرحال یہ ہے سلیم! مختصر الفاظ میں اس سوال کا جواب کہ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں؟ کہو! تمہارا کیا خیال ہے؟ اسلام آگے چلا ہے یا نہیں؟ والسلام

پرویز

سوال یہ ہے کہ

اگر انسان کی عقل، زندگی کے تمام معاملات کا اطمینان بخش حل دریافت کر سکتی ہے تو پھر اسے آسمانی راہ نمائی کی کیا ضرورت ہے؟

یہ درست ہے

لیکن دیکھنا تو یہی ہے کہ کیا تنہا عقلِ انسانی ایسا کر سکتی ہے؟ یہ سوال نہایت اہم ہے۔ اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں۔ مؤرخوں۔ سیاستدانوں۔ مدبروں۔ سائنسدانوں۔ علومِ معیشت کے ماہروں کے خیالات کا مطالعہ کریں۔ لیکن ہر شخص ایسا نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں سے آسکتا ہے؟ اس مشکل کا حل پرویز صاحب کی معرکہ آرا کتاب

اِنسان نے کیا سوچا؟

نے کر دیا ہے۔ اس میں دنیا بھر کے ائمہ فکر کے خیالات نہایت مربوط انداز میں پیش کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ عقلِ انسانی آج تک کیا کچھ کر سکی ہے اور اب کس مقام پر کھڑی ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن، مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد، عمدہ ٹائپ میں چھپا ہے۔ کاغذ۔ جلد۔ گرد پوش نہایت دیدہ زیب۔ اس قدر خوبیوں اور ضخامت کے باوجود، قیمت صرف بارہ روپے فی جلد۔

(۲) "پیشگی خریداران" کو فرمائش آنے پر کتاب بھیجی جائے گی۔

مکتبہ طلوعِ اسلام۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

سلیم کے نام خطوط

اِس شہرہ آفاق کتاب کے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ چونکہ اس کا اندازِ بیان نہایت شگفتہ اور شاداب ہے اس لئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے نوجوان محض ادبی تفریح کے لئے اِس کتاب کا مطالعہ شروع کرتے ہیں اور آخر میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اِن کی دنیا بدل دی ہے۔ اِس کتاب کی

پہلی جلد کا تازہ ایڈیشن

حال ہی میں شائع ہوا تھا۔ اب اسکی

دُوسری جِلد

بھی شائع ہو گئی ہے جو اُسی حسن و زیبائی کے ساتھ ٹائپ میں چھپی ہے۔

قیمت جلد اوّل۔ آٹھ روپے۔ جلد دوم۔ چھ روپے

(۲) پیشگی خریداران میں سے جو صاحب جلد دوم نہ منگانا چاہیں وہ ۱۵ جنوری تک مطلع فرما دیں اگر اس تاریخ تک اطلاع نہ آئی تو کتاب ہر پیشگی خریدار کو بھیج دی جائے گی۔

مکتبہ طلوعِ اسلام ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

سرسید احمد خانؒ

(۲)

(پولیٹیکل کردار کی روشنی میں)

ایسی چنگاری بھی یارب! اپنی خاکستر میں تھی

(از: محترم صفدر سلیمی صاحب)

اس سے قبل ہم (طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں) حیاتِ سرسید کے کچھ درخشندہ نقوش اجمالاً قارئین کے سامنے لا چکے ہیں۔ ہم نے بتایا تھا کہ سرسید علیہ الرحمۃ کی جامع الصفات شخصیت ہماری عظمتِ رفتہ کی داعی بھی تھی اور نشاۃ ثانیہ کی نقیبِ اولین بھی۔ ہماری نشاۃ ثانیہ کی یہ داستان شہادت دے رہی ہے کہ کم و بیش نصف صدی تک یہ اثر آفریں شخصیت دھڑکتے ہوئے دل کی طرح جسدِ ملت میں کارفرما رہی۔ اس کی انقلاب انگیزیوں اور اثر آفرینیوں نے ہماری قومی زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا۔ اس کے ہنگامہ خیز کارناموں نے اس برصغیر کے طول و عرض میں حرکت و عمل کی لہر دوڑا دی۔ احساس کے صدقے میں مایوسی اور شکست کے افقِ تیرہ و تار سے امیدوں کی صبح بہار نے اپنے چہرے سے نقاب الٹا اور کاروانِ ملت زندگی کی ایک خوش آیند منزل کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

سرسید کی زندگی کا یہ اجمالی خاکہ اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ ہم نے اس کے چمنستانِ حیات کے کچھ گلہائے رنگا رنگ سے ایک گلدستہ ترتیب دے لیا اور بس! لیکن! اس چمنستان کی بسیط فضائیں، اس کے لالہ و گل کی رعنائیاں اور رنگ و بو کی ہمہ آرائیاں اس اجمال کی تفصیل کا مطالبہ کرتی ہیں اور مقصد پیشِ نظر کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس عظیم القدر شخصیت کا ہر اہم گوشہ نکھر کر قارئین کے سامنے آئے۔ بنا بریں اشاعت زیرِ نظر میں ہم اس زعیم قوم کی ہمہ گیر عظمت کا ایک امتیازی نقش موضوعِ تحریر بنا رہے ہیں۔ یہ نقش ہے ــــ سرسید کا پولیٹیکل کردار ــــ یعنی سیاست کی جولانگاہ میں اس کے کارناموں کی روئیداد۔

سرسید کی سیاسی تگ و تاز کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس تلخ حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یہ کھلنڈرا نوجوان "جب شباب و شعور کی وادی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا تو وہ دور عالمِ اسلام اور دنیائے مشرق دونوں کی تاریخ کا ایک نازک ترین مرحلہ تھا۔ ایشیائی قومیں حسرت

دیا۔ س کے آنسوؤں سے اپنے سرمایۂ حیات کو راکھ کے ڈھیروں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ اور عالم اسلام بے بسی اور بے آبروئی کی تاریکیوں میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ نہ تو ان درماندہ قافلوں کا کوئی غمگسار اور راہ نما تھا اور نہ ان ڈوبتے ہوئے سفینوں کا کوئی کھیون ہار اور ناخدا۔ نہ اس اندھیرے میں امید کی کوئی کرن جلوہ بار تھی اور نہ اس راکھ میں غیرت کی کوئی چنگاری شعلہ زن۔

بے بسی، مایوسی اور شکست کے اس جگر پاش ماحول میں مغربی استعمار کی ہوسناکیوں کو اپنے ارمان پورے کرنے کا سنہری موقع ہاتھ لگا۔ وہ گدھوں اور کرگسوں کی طرح مشرق کی "شکارگاہوں" کی طرف بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کی دم توڑتی قوموں کے گوشت پوست اور خون سے کام و دہن کی آزمائش شروع کر دی۔ دیگر ممالک کی طرح برصغیر ہند میں بھی یہ مغربی سامراج عجز و انکسار کی معصومانہ اداؤں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور تھوڑی سی مدت میں یہاں کے سیاہ و سفید پر مسلط ہو گیا۔

زوال و انحطاط اور غلامی کی اس قومی بے چارگی میں کیا کسی کے تصور میں بھی یہ بات آ سکتی تھی کہ ایک کھلنڈرا اور لاابالی چھوکرا جو دلی کے گلی کوچوں میں کنکوے اڑایا اور ناچ مجرے دیکھا کرتا تھا اور پھر باپ کی وفات کے بعد تلاش روزگار کے لئے انگریزی حکومت کے دفتروں میں مارا مارا پھرتا تھا ——— ایک دن اسلامیانِ ہند کی مسیحائی کا شرف حاصل کرے گا۔ اور غم و غصہ اور غیرت و حمیت کی بجلیاں، تدبر و فراست کے دامن میں سمٹائے اس قلندرانہ انداز سے عرصۂ کارزار میں داخل ہو گا کہ ڈوبتی ہوئی نبضیں حیاتِ تازہ سے معمور ہو جائیں گی اور برصغیر کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔

لیکن یہ تاریخی معجزہ نمودار ہوا اور اسی نوجوان کے ہاتھوں رونما ہوا جس نے کبھی معاشی پریشانیوں میں صدر امینی کے دفتر میں ایک معمولی سررشتہ دار کی آسامی قبول کی تھی اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ——— اور تو اور ——— برٹش امپریلزم کے بڑے بڑے ستون اس کی عظمت کے حضور سرنگوں ہو کر خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے اور اس کی ملت کا سفینۂ بھنور کو شکست دے کر ساحل مراد کا رُخ کر رہا تھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت ہند کے ہنگاموں سے قبل حیات سر سید میں سیاسی کشمکش کی کوئی ہنگامہ آرائی نظر نہیں آتی۔ یہ درست ہے کہ سرکاری ملازمت کے اس دور میں وہ مختلف علمی موضوعات پر بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ لیکن جہاں تک میدانِ سیاست کا تعلق ہے یہاں وہ قطعاً کنارہ کش نظر آتے ہیں ——— علمی جدوجہد میں بھی اور فکری و نظری کاوشوں میں بھی ——— لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہند کی تمام تر ذمہ داری جس شدت سے اکیلے مسلمانوں کے سر تھوپی گئی۔ اور جوشِ انتقام کی بجلیاں جس بیدردی سے ان کے خرمنِ حیات پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں اس نے سر سید کے جذبات و حسیات میں ایک آگ سی بھڑکا دی۔ حالی نے حیاتِ جاوید میں ان کے ایک دوست کا یہ قول نقل کیا ہے:

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے سر سید کے دل پر وہ کام کیا جو نوتھر کے دل پر بجلی گرنے نے۔

لیکن اس شدید تاثر کے باوجود وہ ایک جذباتی نوجوان نہیں تھے۔ فطرت کی فیاضیوں نے انہیں تدبر، فراست، بلند بینی اور دور اندیشی کے اوصاف سے بدرجۂ اتم نوازا تھا۔ چنانچہ قوم کو بچانے کے لئے انہوں نے جو راہ اختیار کی وہ ایک دور بین اور حقیقت پسند مدبر کی راہ تھی۔ اس نے کبھی جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ قوم کی مدافعت کے لئے دلائل و براہین سے مسلح ہو کر میدان میں آیا۔ براہ راست انگریزوں اور

بے گانوں کی عقل و بصیرت سے اپیل کی۔ اور سرکاری ملازمت کی تمام مجبوریوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر حقائق کے چہرے سے تمام نقاب الٹ دیئے۔ اُس نے پوری قوت سے انصاف پسند دنیا کو یوں خبردار کیا۔

> کوئی آفت ایسی برپا نہیں ہوئی جس کے متعلق یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے برپا کی۔ خواہ وہ رام دین اور ماتادین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمانوں سے نہیں آئی جس نے سب سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ تاکا ہو۔ کوئی کانٹوں دار درخت اس زمانے میں نہیں اُگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے بویا۔ اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ مشہور نہ کیا گیا ہو کہ اسے مسلمانوں نے اٹھایا۔

(دلائل محمڈنز آف انڈیا)

انگریز حکمرانوں کو بخوبی معلوم تھا کہ بغاوتِ ہند کے ہنگامہ ہائے قتل و غارت میں سرسید نے سینکڑوں انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں اس فریضہ کی ادائیگی میں بارہا ایسا ہوا کہ ان کی اپنی جان خطرے میں پڑ گئی۔ حکمراں یہ سب کچھ جانتے تھے۔ انھیں اس حقیقت کا بھی اعتراف تھا کہ سرسید نے یہ سب کچھ خالص انسانی ہمدردی کے تحت کیا تھا اور ادنیٰ مفاد بھی پیش نظر نہیں تھا۔ اس کے باوجود جب انھیں ان خدمات کے صلہ میں رؤسائے چاندپور کی ضبط شدہ جاگیر اور اس کے ساتھ ایک اور معقول جائیداد بطور انعام پیش کی گئی تو اس نے یہ کہہ کر اس پیشکش کو مسترد کر دیا کہ "ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی"۔

خود سرسید نے ۲۸ر دسمبر ۱۸۸۹ء کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک تقریر میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

> میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ چنانچہ میں نے اس کے لینے سے صاف انکار کر دیا۔

اسی تقریر میں انھوں نے اپنی وہ کیفیت بھی واضح کی ہے جو صورتِ حال کے شدید تاثرات ان پر طاری ہوئی۔ انھوں نے کہا

> میں اس وقت ہرگز یہ نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپ سکے گی اور از سر نو عزت پانے کے قابل ہو جائے گی۔۔۔۔
>
> آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید ہو گئے۔ (حیاتِ جاوید)

رنج و ملال اور مایوسی کی یہ کیفیت اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ سرسید نے اس سرزمین سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن حالات کے تقاضے اسے "مسیحائے قوم" کے منصب پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ اور ڈوبتی ہوئی نیا کو بچانے کا اعزاز اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ چنانچہ مزید غور و فکر کے بعد وہ بزدلی کی راہ اپنانے سے رُک گیا اور اس نے مردِ میدان بن کر قومی مسیحائی کا فرض ادا کرنے کا عزم کر لیا۔

صورتِ حال بے حد نازک تھی۔ چاروں طرف مارشل لا کے بھیانک سائے چھائے ہوئے تھے۔ چوراہوں پر پھانسیاں نصب تھیں۔ بڑے بڑے معزز گھرانوں اور ممتاز خاندانوں کا صفایا ہو رہا تھا۔ حکمرانوں کے چہرے جوشِ انتقام اور فرطِ غضب سے تمتما رہے تھے۔ ہر طرف زبانوں پر سکوت کی مہریں لگی تھیں۔ اور دلوں پر خوف و ہراس کے پہرے بٹھا دیئے گئے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کے نئے جانشینوں نے انھیں اپنا جانی دشمن تصور کر لیا تھا اور ایسا خیال کرنے کے اسباب بھی بظاہر موجود تھے۔ ایسے محشرستان میں معمولی سی جرأت بھی بدترین مصائب کا پیش

خیمہ بن سکتی تھی۔ لیکن ایک مسیحائے قوم کا عزم و جنون ایسے خطرات کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ سرسید اسی مسیحائی عزم سے لیس ہو کر مردانہ وار آگے بڑھا اور بغاوتِ ہند کے حقیقی اسباب اہم تشریح کرنے کے لئے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کی تالیف و تدوین شروع کر دی۔ (سرسید کے نزدیک اسباب بغاوت میں انگریز حکمرانوں کے اپنے جرائم کی فہرست کافی طویل تھی) ہوا خواہوں اور دوستوں نے اسے اس پُرخطر اقدام سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ واضح کیا کہ ایسی جرأت موت کے وارنٹ پر دستخط کرنے کے مترادف ہو گی۔ لیکن اس پیکرِ عزم و استقلال نے کسی کی نہ سُنی اور اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ اہم کتاب شائع ہوئی اور اس کے نسخے ایک ایک کر کے برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان، سیاسی مدبرین اور اربابِ اقتدار کے ایوانوں تک پہونچ گئے۔

۱۸۵۸ء کے پُرخطر اور بھیانک ماحول میں یہ جرأتِ رندانہ کتنے بڑے خطرے کی دعوت تھی۔ اسے جاننے کے لئے یہ ایک ہی واقعہ کافی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا فارن سکریٹری (مسٹر سیسل بیڈن) جوشِ غضب سے چیخ اٹھا۔

> اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ اس سے حسبِ ضابطہ فوراً باز پرس کی جائے اور اگر
> کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دی جائے۔

اگر غور کیا جائے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسٹر سیسل بیڈن نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں تھا۔ ۱۸۵۸ء کے اُس ماحول میں نشۂ اقتدار کی نئی نئی سرمستیوں میں حکمرانوں کی زبان شکست خوردہ عوام کے ایک ترجمان کو بھلا اور کن الفاظ سے نوازتی؟ برطانوی حکمران جو پہلے ہی تملائے ہوئے تھے سرسید کی اس حق گوئی و بے باکی سے خوش ہوتے یا ناراض، سرسید نے ایک فرض بہرحال ادا کرنا تھا اور اس نے وہ مردانہ وار ادا کر دیا۔ اُس کا یہ شاہکار ملکی سیاسیات میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور پھر یہ کارنامہ جذبات کی کوئی ہنگامی روداد نہیں تھا بلکہ دلائل و براہین اور حقائق و شواہد کی ایک جیتی جاگتی اور ناقابلِ انکار داستان تھی۔

اس رسالہ کے آغاز میں ہی اُس نے بغاوت کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے صاف اور واشگاف الفاظ میں یہ لکھا۔

> "۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دلوں میں جمع ہوتی جاتی
> تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا۔ صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی۔ اور فوج کی بغاوت
> نے یہ آگ لگا دی۔ (رسالہ اسباب بغاوت ہند)

اور پھر اس نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا کہ کس طرح حکمرانوں کی استعمار پسندی نے عوام کے خدشات کو ابھارا۔ کس طرح حکومت اور اُس کے کل پرزوں نے عیسائیت کی تبلیغ میں قابلِ اعتراض سرگرمیاں دکھائیں۔ کس طرح سرکاری ملازمین کو پادریوں کے وعظ سننے پر مجبور کیا گیا۔ کس طرح پادریوں نے دوسرے مذاہب کے بزرگوں کی توہین کی اور عوام کے مذہبی احساسات کو زخمی کیا۔ کس طرح مشنری سکولوں کا جال پھیلایا گیا۔ اور لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ ان میں اپنے بچے داخل کرائیں۔ کس طرح لجسلیٹو کونسل سے امورِ مذہبی میں مداخلت ہوئی اور ایکٹ ۲۱ سنہ ۱۸۵۰ء مذہبی قواعد پر خلل انداز ہوا۔ کس طرح ضبطیٔ اراضیات کے قانون نے عوام کو رنجیدہ کیا۔

الغرض انگریزی حکومت کے ان جرائم کی جو بغاوتِ ہند پر منتج ہوئے۔ ایک طویل فہرست تھی جو سرسید نے مدلل طور پر رسالہ

میں پیش کی۔ اور برطانوی مدبرین پر واضح کیا کہ بغاوت ہند کی محرک خود انگریزی حکومت کی غلطیاں اور غلط کاریاں تھیں۔

سرسید کا یہ کارنامہ اس کی عظیم مردانہ جرأت کا آئینہ دار تھا اور اس سے جہاں بہت سے مستبد انگریز تلملا اٹھے وہاں حقیقت پسند مدبرین نے اسے خراجِ تحسین بھی پیش کیا۔ چنانچہ مسٹر تھیوڈور ماریسن نے ان کے سیاسی کارناموں پر ایک آرٹیکل میں اس رسالہ کے متعلق لکھا:۔

> اس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی سچی بات جو عام پسند نہ تھی منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی ۱۸۵۸ء میں یہ بہت بڑی دلیری اور جرأت کا مظاہرہ تھا۔

انگلستان کے مشہور اخبار "ہوم نیوز" نے سرسید کی اس معرکہ آرا تصنیف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

> اس نے انتہائی دلیری سے اپنی رائے کا اظہار کیا اور یہ بات محتاج بیان نہیں کہ اس کی اس جرأت مندانہ رائے نے حکمراں طبقہ کو بے حد متاثر کیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ مشہور برطانوی مدبر ڈاکٹر ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں "انڈین مسلمانز" کے نام سے ایک اشتعال انگیز کتاب شائع کی تھی اور اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ

> مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو گورنمنٹ سے لڑنا اور جہاد کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی ہے۔ اور کسی طرح بھی گورنمنٹ کی خیر خواہ نہیں بن سکتی۔

اس کتاب کا عنوان ہی یہ عبارت تھی۔

> "کیا ہمارے ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے ایمان ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنا فرض ہے"

اندازہ لگائیے کہ ڈاکٹر ہنٹر جیسے با اثر اور ممتاز انگریز کی اس کتاب نے انگریزوں کو کس قدر متاثر کیا ہوگا۔ مسلمانوں کے خلاف ان کے دلوں میں کیسی کیسی تشویشناک بدگمانیاں ابھری ہوں گی۔ غیض و غضب اور بغض و عناد کا کیسا تند و تیز طوفان برپا ہوا ہوگا اور پھر اس سے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کو جو پہلے ہی غبار آلود تھا مزید گھناؤنی صورت دینے میں کون سی کسر باقی رہ گئی ہوگی۔

ڈاکٹر ہنٹر سرسید کا دوست تھا اور سرسید نے جب اس کتاب کو پڑھا تو اس کے رنج و ملال کی کیفیت نہ پوچھئے بیساختہ منہ سے نکلا کہ "خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے۔" بڑا ہی نازک مرحلہ سامنے تھا۔ بنگال میں وہابی تحریک ابھی کچلی جا رہی تھی۔ وہاں کے چیف جسٹس مسٹر نارمن ایک سرپھرے اور مشتعل مسلم نوجوان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ حکمرانوں کے دلوں میں جوشِ انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے اور بدنصیب مسلمانوں کا خرمنِ حیات ان شعلوں کی زد میں تھا۔

ایسے نازک اور کڑے وقت پر سرکاری ملازمت کی تمام ذمہ داریوں اور مصلحت کوشیوں سے بغاوت کرتے ہوئے سرسید ایک بار پھر قلندرانہ انداز میں آگے بڑھا اور ڈاکٹر ہنٹر کی بہتان طرازیوں کے پرخچے اڑانے کے لئے اُس نے اپنے قلم کو حرکت دی۔ ڈاکٹر ہنٹر کی الزام بازیوں کا منہ توڑ جواب "پانیر" کے کالموں میں شائع ہو رہا تھا۔ اور اس کے بعد سر ولیم میور جیسے چوٹی کے انگریز برملا کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر ہنٹر نے مسلمانوں

کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ محض تہمت تراشی ہے۔

"انڈین آبزرور" کے یورپین ایڈیٹر نے لکھا:۔

ممکن نہیں کہ کوئی بیان سرسید کے اس بیان سے زیادہ صاف ہو اور اس سے ان لوگوں کا اطمینان ہو جانا چاہیئے جو (ڈاکٹر ہنٹر کی طرح) بزدل اور وہمی ہیں۔

سر ایلیفرڈ لائل نے سرسید کی موت پر ایک لمبے میں جو "تھیولوجیکل ریویو" میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی اس کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھا۔

اس مصنف (ڈاکٹر ہنٹر) کو مبالغہ آرائی کا جن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے اور بہتر ہوتا کہ وہ اس جن کو اتار دیتا۔

الغرض سرسید کی مومنانہ جرأت اور دلائل و براہین نے ایک بار پھر اپنی ملت کی کامیاب اور قابل تحسین مدافعت کی اور ڈاکٹر ہنٹر کا انگلستان تک اپنی ہی قوم میں وہ مضحکہ اڑا کہ بابد و شاید۔ سرسید کا یہ کارنامہ ہماری سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے اور کوئی قوم اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتی۔

یہ داستان نامکمل رہے گی اگر ہم ڈاکٹر ہنٹر کی اس کتاب کے اس اہم سوال کا ذکر نہ کریں جو اس نے علمائے اسلام کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کیا تھا اور اس وقت کے خطرناک حالات کے پیش نظر صرف ایک سرسید ہی تھا جو اس کا مردانہ وار جواب دینے کے قابل ہو سکا۔ سوال یہ تھا کہ

"اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو کیا اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزی حکومت کی امان ترک کرنی اور غنیم کی مدد کرنی جائز ہوگی؟

غور فرمایئے کہ کس قدر نازک تھا یہ سوال (ہنٹر کے الزامات کی روشنی میں)۔ اور کس قدر عظیم جرأت اور بلند فراست کی ضرورت تھی اس کا کماحقہ جواب دینے کے لئے۔ چنانچہ سرسید نے جواباً صاف صاف کہہ دیا۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ کل کسی بڑے ملکی ہنگامے میں قوم کا کیا حال ہوگا۔ لیکن میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کچھ کریں گے جو ان کی پولیٹکل حالت اُن سے کرائے گی۔

یہ نہ بھولئے کہ یہ سب کچھ دو ٹوک کہنے والا انگریزی حکومت کے دفتر میں ملازم بھی تھا اور بات وہ کہہ گیا جو ایک آزاد، سربلند اور غیور و جسور قوم کی دھڑکنوں کی ترجمان تھی۔

اس واقعہ کے کوئی پانچ برس بعد سرسید ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علی گڈھ چلے آئے اور اپنے آپ کو دارالعلوم کے لئے وقف کر دیا۔ لاریب کہ دارالعلوم علی گڈھ کا قیام بڑی حد تک اسلامیان ہند کی سیاسی جدوجہد سے مربوط ہے اور اس کے ساتھ ان کے ہاتھوں سائنٹیفک سوسائٹی اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن جیسے اداروں کا قیام ان کے سیاسی کارناموں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان خدمات کا تذکرہ ہم ایک الگ عنوان کے تحت کریں گے۔ زیر نظر عنوان میں ہم سرسید کی خالص سیاسی خدمات اور پولیٹکل کردار کے تذکار پر اکتفا

کریں گے۔ ہم نے اس سلسلے میں جو کچھ پیش کیا ہے اس سے یہ وضاحت مقصود تھی کہ ایک ایسے نازک اور کڑے وقت میں جبکہ اسلامیانِ ہند ایک اپنی سلطنت اور عروج و اقبال کا تمام سرمایہ لٹا کر سیاسی زوال، شکست اور موت کی آخری ہچکیاں لے رہے تھے۔ اور دوسری طرف انگریز نشۂ اقتدار اور جوشِ انتقام کی تندی میں برادرانِ وطن سے سازش کر کے ہماری شہ رگ تک کاٹ دینے پر تلے ہوئے تھے۔ سرسید نے انھیں نہ صرف موت سے بچالیا بلکہ ان کی قومی زندگی کا رُخ عروج و اقبال کی منزلوں کی طرف بھی پھیر دیا۔ اور اس مقصدِ عزیز کے لئے اُس نے جو راہ اختیار کی وہ انتہائی دور اندیشی، صحت و سلامتی، خودداری و خودشناسی کی راہ تھی، اور حسن تدبیر کے ساتھ ساتھ بلند فراست کا شاہکار بھی۔ سرسید نے نہ صرف ہمارے کاروانِ ملت کے لئے یہ راہ متعین کی بلکہ اس نے ہمیں اس راہ پر چلنے کے انداز بھی سکھائے۔ وہ نہ صرف ہمیں ہماری منزل کا پتہ دے گیا بلکہ اس راہ پر چلانے والے جانشین بھی پیدا کر گیا۔ اُس کے اٹھ جانے کے بعد بھی ہمیں قدم قدم پر اپنے دشمنوں کی بدترین دشمنی اور مکاری و عیاری سے دوچار ہونا پڑا لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جس "اسلحۂ جدید" سے وہ ہمیں مسلح کر گیا۔ اس کی بدولت ہم ہر حملے اور ہر شبخون کا منہ توڑ جواب دینے کے قابل ہوگئے۔ آج ہم آزادی و استقلال کی منزلِ مقصود پر کامیاب و کامران کھڑے ہیں۔ یہی وہ منزل تھی جس کا حسین خواب سب سے پہلے سرسید نے دیکھا تھا۔ اپنے طے کردہ سفر پر ایک نگہِ بازگشت ڈالئے اور دیکھئے کہ ہمیں کتنے موڑ مڑنے پڑے۔ کتنے موانعات کو راستے سے ہٹایا، کتنے طوفانوں کو ساکن کیا گیا، کتنی سازشوں کے جال توڑے گئے۔ سرسید کے سوا آخر کون تھا جس نے ہمیں ان عظیم صلاحیتوں اور انقلاب آفریں قوتوں سے مالا مال کیا۔ اُسے ہم سے رخصت ہوئے نصف صدی سے زیادہ مدت گذر گئی۔ لیکن آج بھی ہماری نشاۃ ثانیہ کی جس تحریک کا جائزہ لیجئے وہ اسی سرچشمہ کی جوئے رواں نظر آئے گی۔ اس نے جس منزل کی طرف ہمارے قافلے کا رُخ موڑا اور جو نشانِ راہ قائم کئے وہ لازماً اسی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے ضامن تھے جو قیامِ پاکستان پر منتج ہوئی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ

> میں جب رات کو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو اس کے اس حصّے کی جو نیلا نیلا، سیاہ اور ڈراؤنا سا دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا بلکہ ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اُس میں چمکتے ہیں اور معشوقانہ انداز کی کشش سے ہمیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

اور پھر وہ اپنے ساتھیوں سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ

> کیا تم اپنی قوم میں اس قسم کے لوگ پیدا کئے بغیر جو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں، اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوموں کی نگاہ میں باعزت بنا سکتے ہو؟

اور اس کی وفات پر مؤرخ کے قلم نے شہادت دی کہ واقعی وہ دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے اپنی قوم کا آسمان سینکڑوں درخشندہ ستاروں سے روشن کر گیا۔

اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ اس زعیم قوم نے قوم کو بچانے کے لئے جو کارنامے پولٹیکل جدوجہد میں سرانجام دیئے وہ محض رسمی کوششوں کا نتیجہ نہیں تھے۔ اس کا سینہ قومی درد و غم سے سوز و ساز، تڑپ اور خلش کا نشیمن بن چکا تھا۔ اس کی زندگی کی سینکڑوں راتیں قوم کے غم میں بستر پر کروٹیں بدلتے گزر گئیں۔ اس نے اپنوں اور بیگانوں کی گالیاں کھائیں۔ اس نے بارہا خطروں کو دعوت دی اور بارہا اس آگ میں کودا۔

نواب محسن الملک اور دیگر رفقائے سرسید گواہ ہیں کہ اکثر ایسا ہوا کہ رات کو اس کا بستر خالی پڑا تھا اور وہ انتہائی بے چینی کے عالم میں چکر کاٹتا، آنسو بہاتا، آسمانوں پر ٹکٹکی جمائے دعائیں مانگتا نظر آتا تھا۔ قومی تعمیر کے لئے جب بھی روپے پیسے کا سوال سامنے آیا تو اس نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں اور کس سے مانگتا ہوں۔ اس نے علی گڑھ کی نمائش میں کتابوں کی دوکان بھی لگائی۔ قومی رضا کار بن کر گلے میں جھولی بھی ڈالی اور پھر غریب طلبہ کی امداد کے لئے پنی رنگ کا جو جلسہ کیا اس میں "جھوٹی عزت" کے احساس سے بے نیاز ہو کر اسٹیج پر غزلیں بھی گاتا رہا۔ اسی قسم کے ایک جلسہ میں اس نے حافظ شیرازی کی ایک غزل گائی جس کا پہلا شعر یہ تھا

ساقیا برخیز و دردہ جام را   خاک برسر کن غم ایام را

اور اسی اثر انگیز ماحول میں گاتے گاتے آخر میں اپنے ان دو شعروں کا اضافہ کیا۔

قوم ما ملے قوم ما از بہر تو   دادہ ام بر باد ننگ و نام را

صبر کن احمد بہ سختی روز و شب   عاقبت روزے بیابی کام را

ان اشعار سے سرسید کے داخلی اضطراب اور سوز و ساز کا اندازہ لگانا مشکل نہیں اور خلوص و ایثار کی یہی وہ تڑپ تھی جو اس کی قوم کی نشاۃ ثانیہ کی دلیل بنی۔

سرسید کس قدر عظیم و جلیل انسان تھا اس کا اندازہ لگانے کے لئے اس خراجِ تحسین کو نگاہوں کے سامنے لائیے جو اس کی وفات پر دیگر اقوام کے مشاہیر نے پیش کیا۔ علامہ اقبال کے استاد پروفیسر آرنلڈ کی بلند نگہی کا کسے اندازہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

حقیقی عظمت کا مستحق اگر کوئی انسان ہو سکتا ہے تو سرسید احمد خاں یقیناً اس کے مستحق تھے۔ دنیا میں بہت کم انسان ایسے گذرے ہیں جن میں یہ حیرت انگیز لیاقتیں اور اوصاف مجتمع ہوں۔ وہ علانیہ دنیا کے سامنے ایک قائد کی حیثیت سے اسلئے نمودار ہوتا کہ جس بات کو وہ سچ اور صحیح سمجھے اس کیلئے ساری دنیا سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار اور آمادہ ہے۔ اس کے پاس نہ جاہ و مرتبہ تھا نہ دولت تھی اس کے باوجود وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا سردار بن کر ظاہر ہوا۔ یہ وہ مقام ہے جو اس سے پہلے کسی شخص کو تلوار کے بغیر حاصل نہیں ہوا۔

ایچ۔جی۔ رالنس نے لکھا ہے کہ،

سرسید کے کردار کا نمایاں پہلو تھا ان کی کامل بے خوفی۔ ان کی صاف گوئی بعض اوقات تشویشناک ہو جاتی تھی۔ ان کا مخاطب وائسرائے ہند ہو یا کوئی متعصب آیا کوئی عیسائی مشنری ہو یا اخباری نمائندہ وہ کہتے وہی کچھ تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا۔ بدنامی، مخالفت، گالیاں، جان لینے کی دھمکیاں، کوئی خوف انہیں اپنے عزم سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔

سی۔ ایف اینڈریوز نے یوں اظہارِ تحسین کیا ہے۔

انیسویں صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے نمایاں شخصیت سرسید کی ہے۔ غدر کے دب جانے کے بعد مسلمانوں نے سب سے زیادہ مصیبت انگریزوں کے ہاتھوں اٹھائی۔ اچھے اچھے خاندان تباہ ہو گئے، اور شمالی ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ان کی حالت مایوس کن ہو گئی۔ ... جس شخص نے اس مایوسی کا طلسم توڑا وہ سرسید احمد خان تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سرسید جیسا اولوالعزم انسان ہی ان مشکلات پر اس طرح قابو پا سکتا تھا۔

بابُ المراسلات

۱۔ الوہیاتی توانائی ایک صاحب، پرویز صاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ "آپ انسانی ذات کے لئے "الوہیاتی توانائی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ "توانائی" ذاتِ خداوندی کا جزو ہے؟"

جواب:۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے یہ توانائی مادی اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہیئے کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے "مادی توانائی" کہتے ہیں۔ انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار اور ارادے کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسم انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے کہ طبیعی توانائی، اس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس "توانائی" کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں۔ خدا کی طرف سے براہِ راست ملی ہے۔ یہ انسانی ذات ہے اسی کو میں "الوہیاتی توانائی" سے تعبیر کرتا ہوں۔ "الوہیاتی" ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں "الٰہ (خدا) کی طرف منسوب"۔ لہٰذا "الوہیاتی توانائی" سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی طرف منسوب ہے واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی "غیر از خدا" کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ "انسانی توانائی" کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ "مادی توانائی" سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی، خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ "ذات" کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انسانی ذات یا الوہیاتی توانائی کے ساتھ یہ لکھ دیا کرتا ہوں کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہے۔ ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ اسے ذاتِ خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ "توانائی" ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے۔ نہ اس کی انتہائی اس کی ذات سے جا کر مل جانا ہے۔ یہ توانائی، غیر نشوونما یافتہ شکل (UN-DEVELOPED FORM) میں ملتی ہے۔ اور اسے نشوونما دینا، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی کے لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اسکی

ذات پر مرتب ہوتا ہے اور اس کی ذات اس کے طبیعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔ (پرویز)

۲۔ اسلامی اور قرآنی راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ اپنی تحریروں میں اکثر "قرآنی نظام" "قرآنی دستور" "قرآنی معاشرہ" وغیرہ لکھتے ہیں۔ "اسلامی" نہیں لکھتے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب: نزولِ قرآن کے زمانے میں تو قرآنی اور اسلامی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جو بات قرآنی تھی وہی اسلامی تھی اور جو اسلامی تھی وہ قرآنی بھی تھی۔ اس لئے کہ اس زمانے میں اسلام نام ہی قرآن کے مطابق چلنے کا تھا۔ لیکن بعد میں، جب مسلمانوں کی گاڑی نے پٹڑی بدل لی تو رفتہ رفتہ اسلام اور قرآن میں بُعد ہوتا گیا حتیٰ کہ اسلام میں اکثر و بیشتر ایسے تصورات، عقائد اور مسالک شامل ہو گئے جو قرآن کی ضد تھے۔ یہی اسلام اب تک مروج چلا آرہا ہے۔ لہٰذا آج جس چیز کو "اسلامی" کہا جائے ضروری نہیں کہ وہ قرآنی بھی ہو۔ ہماری دعوت یہ ہے کہ ہم اپنے تمام تصورات، عقائد و مسالک کو غیر قرآنی عناصر سے پاک کر کے پھر سے اپنی زندگی قرآن کے مطابق بنائیں۔ جب ایسا ہو جائے گا تو پھر قرآنی اور اسلامی ایک ہی بات ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت ان دونوں میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ اِس وقت ہم "اسلامی" اس لئے نہیں کہتے کہ اس سے ذہنِ مروجہ اسلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو کلیتہً قرآنی نہیں ہے۔

آپ صبح سے شام تک یہ سنتے رہتے ہیں کہ "اسلام میں یوں آیا ہے"۔ "اسلام کی رُو سے فلاں بات یوں ہے"۔ "اسلام یہ کہتا ہے"۔ لیکن جب آپ ایسا کہنے والے سے پوچھیں کہ صاحب! جو کچھ آپ نے کہا ہے اس کی سند کیا ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے جواب میں کسی طبری، کسی ابنِ کثیر، کسی رازی، کسی غزالی کا نام لے دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وارث شاہ اور بلھے شاہ تک کے بھی حوالے پیش کر دیئے جائیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لئے کسی انسان کی سند کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے سند صرف خدا کی کتاب کی ہونی چاہیئے۔ جس دن ہم نے یہ اصول اختیار کر لیا کہ کسی بات کے اسلامی ہونے کے لئے قرآن کی سند درکار ہے، اس دن اسلامی اور قرآنی ایک ہی ہو جائے گا۔ آپ کو غالباً یاد ہو گا کہ ۱۹۵۷ء کے اسلامک کلوکیم (جو لاہور میں منعقد ہوا تھا) پرویز صاحب نے یہی سوال اٹھایا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں سب سے پہلے یہ اصول مقرر کر لینا چاہیئے کہ ہم میں سے جو شخص بھی یہ کہے کہ "اسلام نے یوں کہا ہے"، اسے اپنے دعوے کی تائید میں قرآن کی آیت پیش کرنی ہو گی۔ اور اگر اس کے پاس قرآن کی تائید نہ ہو تو اسے یہ کہنا نہیں چاہیئے کہ "اسلام نے یوں کہا ہے"۔ اسے یہ کہنا چاہیئے کہ فلاں صاحب کا یہ قول ہے۔ فلاں بزرگ نے یہ فرمایا ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ اس سے بات واضح ہو جائے گی اور اسلام کے سر خواہ مخواہ وہ کچھ نہیں تھوپا جائے گا جس سے اسلام کو کچھ واسطہ نہیں۔

آج جو کچھ ہمارے ہاں "اسلامیات" کے نام سے مکتبوں، دارالعلوموں، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے (یا جس کی ریسرچ کے لئے کئی ادارے قائم ہیں) اس میں قرآن کا بہت کم حصہ ہوتا ہے اور بیشتر وہی کچھ ہوتا ہے جسے "قرآنی اسلام" سے دور کا بھی

(باقی صـ۶۴ـ پر)

اختلافاتِ قرأت

(علامہ تمنا عمادی صاحب - ڈھاکہ)

اختلافاتِ قرأت کے متعلق جو میرا مضمون ماہ نومبر کے طلوعِ اسلام میں چھپا ہے میرے دو مخلص عزیزوں کے خطوط میرے پاس پہنچے ہیں اور اپنے کچھ شبہے اور کچھ مشورے دونوں نے لکھ کر بھیجے ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ شبہے اور ان کے جوابات طلوعِ اسلام ہی میں شائع ہو جائیں۔ تاکہ دوسرے حضرات کو بھی اگر اس قسم کے شبہے ہوں تو ان کی تشفی ہو سکے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ پہلے عزیز لکھتے ہیں۔

"زمانۂ نبویؐ اور دورِ صحابہؓ کے متعدد مخطوطات دریافت اور دستیاب ہو چکے ہیں۔ جو تاریخی تواتر کی حیثیت سے اس علم الیقین کے حامل ہیں کہ وہ اُن اَدوار کے اصل مخطوطات ہیں۔ مثلاً ۱۔ مکتوب نبویؐ بنام نجاشی ۲۔ مکتوب نبوی بنام منذر بن ساوی ۳۔ مکتوب نبویؐ بنام مقوقس (مصر) ۴۔ مکتوب نبوی بنام اہل خیبر ۵۔ مکتوب حضرت عمرؓ ۶۔ مدینہ منورہ کے ایک پہاڑ پر وہ کندہ تحریر جن میں حضور اکرم صلعم، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اسمائے گرامی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر ابھی حال میں ہمام بن منبہ کا جو مجموعۂ حدیث دریافت ہوا ہے۔ ان کے علاوہ انہیں ادوار کے متعدد مختلف اشخاص ورجال اور قبیلہ وحکومت کے قلمی دستاویزات۔ اور یہ سارے مخطوطات دنیا کے مختلف میوزیم اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ اور ان میں سے بہتیرے مختلف مخطوطات کے فوٹو لے کر بطور نمونہ شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی نقطے والے حروف پر نقطے موجود نہیں۔"

اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ طوالتِ تحریر سے بچنے کے لئے حسب ذیل ہے۔ ۱۔ یا تو سب کو جعلی کہا جائے۔ تو اس کو کوئی صاحبِ عقلِ سلیم ہرگز تسلیم نہیں کرے گا۔ ۲۔ سب تحریریں بغیر نقطوں کے لکھی جاتی تھیں۔ مگر قرآن باضابطہ نقطوں کے ساتھ لکھا جاتا تھا۔ تو اس دعوے کے لئے ٹھوس اور فنی دلیل درکار ہے۔ محض اعتقادی جذبات سے اپیل یا اشعار جاہلیت کی روشنی میں محض (یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا) کہہ دینے سے تحقیق کا حق ادا نہ ہوگا۔ جس زمانے میں تحریر وخط کا جو رواج اور طرز ہوگا اسی کے مطابق ساری چیزیں مکتوب ہوں گی۔ چاہے وہ معمولی اور عام مراسلے ہوں یا کوئی اہم دستاویز الخ"

میرے دوسرے عزیز مخلص نے یوں لکھا ہے۔

۱۔ ابن جنی کے نقل کردہ اشعار اور ابن ندیم کی روایت ایسی دلچسپ خبریں ہیں کہ ہر پڑھنے والا پھڑک اٹھے گا۔ میرے سامنے پہلی بار یہ تحقیق آئی ہے جو دل کو لگتی ہے۔ البتہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں ایک چیز کھٹکتی ہے۔ واذ نُقِّطَت عینٌ تَذَرَّفُ کا لغین میں تذرّف کو نقطت کی رعایت سے ماضی ہی ہونا چاہیئے۔ اور جب یہ ماضی ہے تو تذرفت نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیئے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ مضارع تذرّفُ ہے (جو دراصل تتذرّفُ تھا)۔ لیکن اس صورت میں وہ بات نہیں ہوتی جو ماضی میں ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا جو رسالہ قاریوں والا میں نے پھلواری میں دیکھا تھا۔ اس کی بہت سی چیزیں اس مضمون میں نہیں ہیں۔ کل نہیں تو اس کے ضروری حصوں کا ترجمہ بھی لوگوں کے سامنے آجائے۔ اس سے ان مقدس قاریوں کی سیرت اور رجالیین کی ان کے متعلق رائیں سب کے سامنے آجائیں گی۔

۳۔ ان باتوں کے علاوہ فیصلہ کن جو چیز ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض قدیم ترین نسخے جو دنیا میں موجود ہیں اگر ان کے ایک ایک صفحے کا بھی عکس فوٹو آجائے تو بات صاف ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد مصحف عثمانی فلاں جگہ ہے اور مصحف علی فلاں جگہ۔ اس طرح متعدد مصاحف کی نشان دہی کے بعد لکھا ہے کہ "ان سب کو جعلی کہہ دینا یقیناً قابلِ تسلیم نہ ہوگا تو اگر ایک ایک صفحے کا فوٹو بھی مہیا ہو جائے تو اس کا پتہ مل جائے گا کہ اس وقت کے مصاحف پر نقطوں کا دستور تھا یا نہیں" چنانچہ لکھتے ہیں اور عبارت پر خط کھینچ کر لکھتے ہیں۔

"محترم پرویز صاحب اگر ذرا توجہ فرمائیں تو مختلف مقامات کے پاکستانی سفیروں کی معرفت ان مصاحف کے ایک ایک صفحے کا فوٹو منگوا سکتے ہیں جو اس باب میں ایک ناطق فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اس بحث کے لئے آخری حجت یہی ہو سکتی ہے"

الجواب

سب سے پہلے ہم دوسرے عزیز کے ایک اہم شبہے کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں جو ابن جنی کے پیش کردہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے سے متعلق ہے۔ اس کے بعد پھر دونوں عزیزوں کا یکجائی جواب دوں گا۔ کیونکہ عزیز اول کا شبہ اور عزیز دوم کا دوسرا شبہ ایک ہی ہے۔

اس مصرعہ میں کتابت کی دو غلطیاں ہو گئی ہیں۔ صحیح یوں ہے واذ اُنقِّطَت عینٌ تَذَرَّفُ کالغین۔ ہر مصرعہ پر واو وزن مصرع سے فاضل از روئے زحاف خزم آیا ہے۔ زحاف خَزْم سے ہر مصرعہ پر ایک سے چار حرفوں تک کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ جو تقطیع میں حساب نہیں کیا جاتا اور عموماً اس اضافے کو لکھتے بھی نہیں ہیں۔ قرینے سے سمجھ لیتے ہیں اور اس کے مفہوم کے ساتھ مصرعہ کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ یک حرفی اضافہ واو یا فے یا لام کا اگر ہو تو لکھتے بھی ہیں۔ مگر بہت کم۔ ابن جنی کے امالی میں واو موجود تھا اس لئے میں نے بھی لکھ دیا۔ مگر اذا کا دوسرا الف کتابت میں کاتب سے حذف ہو گیا۔ جس طرح تَذَرَّفُ کی فے پر جو رفع تھا اس کو انھوں نے فتحہ سے بدل دیا۔ اس تصریح کے بعد تو وہ اعتراض باقی

نہ رہا۔ شبہے کا باعث تو اذ تھا کہ یہ ماضی ہی پر آتا ہے اور نقطت ماضی ہے تو شرط کی طرح جزا کا وقوع بھی زمانہ ماضی ہی میں ہونا چاہیئے۔ اگرچہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ مگر مناسب یہی ہے۔ اب جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں اذ نہیں ہے بلکہ اذا ہے اور اذا مستقبل ہی پر آتا ہے۔ ماضی پر آتا ہے تو اس کو بھی مستقبل بنا دیتا ہے تو پھر تذرّف کا بصیغہ مستقبل جزا میں آنا ہر طرح صحیح ٹھہرا۔ اور آپ کا شبہ بالکل رفع ہو گیا

رخان خرّم سے اہلِ ادب تو ضرور واقف ہیں۔ مگر جو لوگ صرف مولوی قسم کے ہیں یقیناً ناواقف ہوں گے۔ وہ سبعہ معلقہ کے پہلے قصیدے کی کوئی شرح دیکھ لیں۔ ورنہ لسان العرب جلد ۱۵۔ لغت خرم صفحہ ۶۷ و صفحہ ۶۸ دیکھ لیں۔ جس میں مثالیں بھی مذکور ہیں۔

مگر اذ ہی رہے جب بھی شعر صحیح و فصیح ہے۔ سورۂ آل عمران کے چھٹے رکوع میں ارشاد ہے ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔ مولویانہ نقطہ نظر سے تو فیکون کی جگہ فکان کہنا چاہیئے تھا۔ پھر فیکون کیوں کہا گیا؟ لیکن ایک ادیب سمجھ لے گا کہ یہاں مراد فجعل یکون ہے۔ اسی طرح یہاں بھی تذرّف سے مراد جعلت تذرّف ہے۔ اس لئے یہاں بھی ماضی ہی ہے۔ مگر اس مثال سے ایک مولوی کی تشفی نہ ہو گی۔ کیونکہ اس آیت میں اذ نہیں ہے۔ ایسی مثال ہونی چاہیئے کہ اذا "نہیں" اذ "آیا ہو ماضی پر اور اس کے بعد مضارع آیا ہو۔ تو لیجئے۔ سورۂ احزاب کی گیارھویں آیت دوسرے رکوع میں پڑھئے۔ اذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا۔ یہاں اذ کے بعد زاغت اور بلغت دو دو صیغے واحد مؤنث غائب بحث اثبات فعل ماضی معروف کے ہیں۔ مگر فوراً ہی ان پر عطف ہوتا ہے صیغہ مضارع کا۔ تظنون یہاں بھی وجعلتم تظنون مراد ہے۔ اس لئے شعر میں "واذ" ہی پڑھئے جب بھی شعر ہر حیثیت سے صحیح بلکہ فصیح ہے۔

دوسرا شبہ مخطوطاتِ قدیمہ پر نقطے نہیں نظر آتے۔ یا قدیم مصاحف پر بھی نقطے نہیں ہیں۔ تو نہ ہوں۔ میں نے یہ کب کہا کہ زمانۂ جاہلیت یا آغازِ اسلام میں عربی لکھنے والے سب کے سب منقوط حروف پر نقطے ضرور لگاتے تھے۔ یا قرآن مجید کی کتابت کا آغاز جس وقت سے ہوا اسی وقت سے اس کے ہر منقوط حروف پر نقطے ضرور لگائے گئے۔ اگر میرا یہ دعوےٰ ہوتا تو بے شک مخطوطاتِ قدیمہ کے فوٹو اور مصاحفِ قدیمہ کا عکس حاصل کر کے مجھ کو قائل کیا جا سکتا تھا۔ اور "فیصد کن" اتمامِ حجت "کا سامان مہیا کیا جاتا۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں۔ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم خط میں ابتداءً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی تھی اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اُس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں"۔ اس کے بعد پھر مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں۔

"پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے ابوالاسود دوئلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں۔ اور انھوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر، مکسور حرف کے نیچے، اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔

اس کے بعد عبدالملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ) کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف والیٔ عراق نے دو علماء کو اس

کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انھوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط، بعض کو غیر منقوط کر کے، اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگا کر فرق پیدا کر دیا۔ اور ابو الاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لئے نقطوں کے بجائے زیر زبر پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

مجھ کو جو اختلاف ہے وہ مولانا مودودی کی خط زدہ عبارت خصوصاً اس میں جو الفاظ جوب خط لکھ دیئے ہیں۔ اُن سے ہے۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ عہد خلفائے راشدین تک عربی رسم خط میں نقطوں کا وجود ہی نہ تھا۔" کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔" سنہ ۶۵ھ سے سنہ ۸۶ھ تک کے اندر ان کے نزدیک "پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض حروف منقوط بنائے گئے۔" میں کہتا ہوں کہ یہ غلط ہے۔ خلاف عقل ہے کہ عربی رسم خط کئی صدی پہلے ایجاد کیا جائے اور اس رسم خط کے نقطے کئی صدی کے بعد ایجاد کئے جائیں۔ نقطے نہ دینا اور بات ہے اور نقطے نہ ہونا اور بات ہے۔ اس لئے مخطوطاتِ قدیمہ کے فوٹو وغیرہ کا ذکر کر کے اور مصاحف قدیمہ کے کم سے کم ایک ایک صفحے کا عکس منگوانے کی فرمائش کر کے اصل بحث کو یا تو غتر بود قصداً کیا جاتا ہے۔ یا اصل بحث کو چونکہ سمجھا ہی نہیں ہے اس لئے اس طرح کی باتیں نادانستہ کی جا رہی ہیں جن سے اصل بحث نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

نقطے بعض قدیم مصاحف پر بھی ہیں مگر اس کا کیا جواب ہے کہ کوئی کہہ سکتا یا لکھ دے کہ یہ نقطے بعد کو کسی نے لگا دیئے ہیں۔ اور ایسا کہنے والے یا لکھنے والے اسی شہرت کی بنا پر کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ پہلے تو عربی رسم خط میں نقطے کا وجود ہی نہ تھا۔ سنہ ۶۵ھ سے سنہ ۸۶ھ کے اندر تو نقطے ایجاد ہوئے ہیں۔ اس لئے اس سے پہلے کے لکھے ہوئے مصاحف پر اگر نقطے ہیں تو وہ یقیناً بعد کو کسی نے لگا دیئے ہیں۔ اس لئے اب کوئی شخص مخطوطاتِ قدیمہ عربیہ کے فوٹو یا مصاحفِ قدیمہ کے فوٹو کا ذکر چھیڑ کر دوسروں کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرے۔

ایک قرینِ عقل بات

یہ بخوبی ممکن ہے کہ اعراب کے لئے بھی پہلے نقطے ہی ہوں۔ مگر رنگین نقطے۔ تاکہ حروف منقوطہ کے نقطوں سے ممتاز رہیں۔ مگر اس میں دشواری تھی کہ لکھنے کے وقت کئی رنگ کی روشنائی رکھنے کی ضرورت کاتب کو پڑتی تھی۔ اس لئے بعد کو اعراب کے لئے رنگین نقطوں کی جگہ وہ شکل اختیار کی گئی جو آج تک مستعمل ہے۔

نقطوں کی بحث ایک دھوکا ہے

جب مولانا مودودی کو خود اعتراف ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم عہد نبویؐ میں زبانی تلقین کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن سن کر قرآن کی سورۃ و آیات یاد کرتے تھے۔ آپ سے نمازوں میں برابر قرآن سنا کرتے تھے تو پھر مصاحف میں حروف پر نقطے ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ یعلمون اگر صرف لکھا ہوا ہو تو کوئی اس کو یعلمون پڑھے اور دوسرا تعلمون پڑھے یہ ممکن ہے مگر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے یعلمون ہی سنا ہے یائے تحتانیہ سے تو کوئی اس کو تعلمون تائے فوقانیہ سے کیوں پڑھنے لگا؟ مصحف میں نقطے نہ ہونے کے سبب سے صحابہؓ نے جو رسول اللہ صلعم سے سُنا اور بار بار سُنا تھا وہ کس طرح مشتبہ ہو سکتا ہے۔ اگر بالفرض ان میں کا کوئی شخص ضعیف الحافظہ ہو اور اس کو یاد نہ رہا ہو کہ ھو خیر مما یجمعون میں یجمعون ہے یا تجمعون۔ تو وہ جب کبھی کسی دوسرے کے سامنے تجمعون پڑھے گا وہ ضرور اس کو لقمہ دے گا اور اس کی تصحیح کر دے گا۔ اگر وہ ضعیف الحافظہ کسی ایک کی تصحیح کو تسلیم نہ کرے گا تو وہ مصحح دو چار بلکہ دس بیس دوسرے

لوگوں سے پوچھ کر اس کی تشفی کرے گا۔ اس لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ مصاحف میں نقطے نہ ہونے کے سبب سے صحابہ رضی اللہ عنہم میں قرأت کا اختلاف ہوا ہو۔ اور جب صحابہ میں اختلاف نہ ہوا تو صحابہ کے شاگردوں میں بھی اختلاف قرأت ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

ہاں چند لوگوں نے قرآن مجید نہ کسی صحابی سے پڑھا نہ کسی تابعی سے۔ بطور خود کسی غیر منقول اور بغیر اعراب والے مصحف میں وہ سب پڑھنے لگے، تو ضرور ان لوگوں کے پڑھنے میں بعض جگہ اختلاف ہوگا۔ مگر ان مختلف فیہ الفاظ میں سے وہی ایک لفظ صحیح ہوگا جو جماعت صحابہؓ کی قرأت متفقہ کے مطابق ہوگا باقی الفاظ جو صحابہ کی قرأت کے مطابق نہ ہوں گے وہ ضرور غلط ہوں گے۔ پھر ایسے لوگ جنہوں نے نہ کسی صحابی سے قرآن مجید پڑھا نہ کسی تابعی سے ان کی من گھڑت قرأتوں کا اعتبار ہی کوئی مسلمان کیوں کرنے لگا؟

غرض جب تعلیم القرآن کا اصل دارومدار زبانی تلقی پر عہد نبوی و عہد صحابہ و عہد تابعین و اتباع تابعین تک برابر رہا تو مصاحف کے منقوط و غیر منقوط ہونے کا ذکر ہی محض دھوکا دینے اور ذہنوں کو منتشر کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سے اختلاف قرأت کے اسباب بیان کرنے میں مصاحف قدیمہ کے منقوط و غیر منقوط ہونے کا کبھی ذکر نہ کیا جائے گا۔ اور اس کا ذکر چھیڑنے والوں کے فریب میں کم سے کم ناظرین طلوع اسلام کبھی نہ آئیں گے۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

میری کتاب جس کا ذکر میرے مخلص عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے جس کا نام قُرَّاءُ الْاُمَّہ ہے۔ یہی کتاب کا ترجمہ تو شکل ہے۔ انشاء اللہ اس میں سے بعض اہم شخصیتوں کے ترجمے میری کتاب اعجاز القرآن حصہ دوم میں آجائیں گے جو زیر تالیف ہے و باللہ التوفیق۔

ابھی تو میرا یہی مضمون تشنۂ تکمیل ہے۔ سات قاریوں میں سے صرف چار قاریوں سے آپ روشناس ہوئے ہیں۔ ابھی تین قاری باقی ہیں۔ حفص بن سلیمان جن کی طرف قرأت متواترہ و مستفیضہ کو یارانِ طریقت نے منسوب کر رکھا ہے ابھی ان سے بھی واقف نہیں ہوئے ہیں۔ پھر حضرت علی و حضرت ابن مسعود و حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کے مصاحف کی حقیقت بھی آپ پر واضح نہیں کی گئی ہے۔ میں اس وقت کچھ اس طرح الجھنوں میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ لکھنے پڑھنے سے تقریباً معطل سا ہو رہا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ذرا بھی اطمینان حاصل ہوا تو اولین فرصت میں اس سلسلہ مضمون کو مکمل کر دوں گا۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

غلطنامہ مضمون اختلافاتِ قرأت

(از صفحہ ۲۶ تا صفحہ ۶۹ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۵۹ء)

(مرتبہ علامہ تمنا عمادی صاحب)

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱	۱۳	واقع ہوگئی	واقع ہوگی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳	۹	لکھ جاییے	لکھ دیا جائے
۳۵	۳	تَذَرَّفَ	تَذَرَّفُ
"	۸	لوجاً	لوحاً
۳۹	۱۱	(اس سطر کو یوں پڑھیئے)	عہد نبوی میں بلکہ جمع صدیقی کے قبل تک خلافت صدیقی میں بھی لکھ
"	۱۳	لکھوایا اور اس کو بھی	لکھوایا، اس کو بھی
۵۳	۱۹	اسم بامسمّٰی	اسم بے مسمّٰی
۵۴	۱۱	مصحف عثمانی کی طرفداروں	مصحفِ عثمانی کے طرفداروں
"	"	(آخر سطر) چھپ	چھین
۵۵	۹	خود ان کو	ضرور ان کو
۵۶	۱۸	نہ معلوم ہے	نہ معلوم ہو سکا
"	۱	(حاشیہ) عبداللہ بن کثیر کو عبداللہ بن کثیر کا	عبداللہ بن کثیر کو عبداللہ بن السائب کا
۶۰	۲۰	کچھ نہ کیا	کچھ لحاظ نہ کیا
"	۱۶	ان کا ذکر	اس کا ذکر
۶۴	۱۹	عذاب الٰہی وبازپرس آخرت سے تخویف کے	(اس کے بعد اتنی عبارت چھوٹ گئی ہے) وہ سرکش اپنی بدکرداری سے باز نہ آئے تو

(بقیہ باب المراسلات ص ۵۸)

واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے بکسر خلاف ہوتا ہے۔ ان حالات میں "قرآنی" اور "مروجہ" اسلام میں فرق کرنا ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ کہیں (ضرورۃً) اسلام کہتا بھی ہے تو اس سے اس کی مراد قرآنی اسلام ہوتا ہے۔

۳۔ جنسی اخلاق

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آجکل "پاکستان ٹائمز" میں ایک بحث چل رہی ہے کہ جنسی اخلاق کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اس میں بعض لوگوں نے عجیب و غریب قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پابندی کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ مہربانی کرکے طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھئے۔ اس کا نوجوانوں پر بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔

طلوعِ اسلام:- اس موضوع پر ایک مفصل مضمون "سلیم کے نام خطوط" کے سلسلہ میں طلوعِ اسلام کی فروری ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے (یہ دراصل ایک تقریر تھی جو پرویز صاحب نے دیال سنگھ کالج میں کی تھی) اس کا پمفلٹ بھی الگ شائع ہوا تھا۔ عنوان ہے "جنسیات کا اثر قوموں کے کلچر پر"۔ یہ پمفلٹ مکتبہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے مل سکتا ہے۔

قائدِ اعظمؒ اور اسلامک آئیڈیالوجی

۲۵ دسمبر کو سینیٹ ہال لاہور میں، یونائیٹڈ مشنز سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام یومِ قائدِ اعظم کی تقریب پر محترم پرویز صاحب کے زیرِ صدارت ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس میں خود پرویز صاحب نے مذکورہ بالا عنوان پر تقریر فرمائی۔ اس تقریر کے (NOTES) لے لئے گئے تھے۔ اب اُسے مرتب شکل میں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ تقریر کے بعد سامعین کا عام تاثر یہ تھا کہ قائدِ اعظمؒ کی مساعیٔ جمیلہ، ان کے خیالات اور نظریات کا جو پہلو اس تقریر میں پیش کیا گیا ہے اس سے پہلے کبھی سامنے نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اس کا تقاضا ہی شروع ہو گیا تھا کہ اسے مرتب شکل میں طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے۔ آپ نے فرمایا:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقریر

برادرانِ عزیز! آج کی تقریب میں شرکت میرے لئے دو وجوہات سے باعثِ فخر و مسرت ہے۔ ایک وجہ تو بالکل ظاہر اور بیّن ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تقریب ملّتِ اسلامیہ کے اُس محسنِ عظیم کی یاد میں منائی جا رہی ہے جس کے یقین محکم اور عملِ پیہم کے صدقے میں آج ہمارا شمار دنیا کی آزاد قوموں میں ہو رہا ہے۔ تاریخ کے جس نازک دور سے ہم گذر رہے تھے، اگر اس وقت حکیم الامت علامہ اقبالؒ (علیہ الرحمۃ) پاکستان کا تصور نہ دیتے، اور اس کے بعد، قائدِ اعظم (علیہ الرحمۃ) بساطِ سیاست پر نمودار نہ ہوتے، تو خود، قائدِ اعظم کے الفاظ میں، "ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک باقی نہ رہتا"۔ اس اعتبار سے ملّتِ پاکستانیہ اپنے قائدِ اعظمؒ کو مخاطب کر کے، بجا طور پر کہہ سکتی ہے کہ

حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گزر کہاں ۔۔۔ تم آ گئے تو مدفنِ کاشانہ ہو گئی

لہٰذا قوم کے اتنے بڑے محسن کا حق ہے کہ اس کی یاد اس شان سے منائی جائے جس کی مستحق اس کی عزت اور عظمت ہے۔

میری مسرت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ تقریب قوم کے نوجوان طالب علموں کے زیرِ اہتمام منائی جا رہی ہے۔ وہ نوجوان جن کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے (نومبر ۱۹۳۹ء میں اپنے پیغامِ عید میں) فرمایا تھا کہ

ہم بڑے بوڑھوں کی کافی آزمائشیں ہو چکی ہیں۔ لیکن میں آج اپنے نوجوان دوستوں سے کہہ دینا چاہتا ہوں جو بیٹھ کر انہیں بھلا دینا چاہتا ہوں (؟) میں ان کے دلوں کے ان تاروں کو چھیڑنا چاہتا ہوں جو ابھی تک زندہ

ولولوں کے نغمے خوابیدہ ہیں۔ اس لئے کہ یہی نوجوان ہیں جن کے کندھوں پر ہماری آرزوؤں کے بروئے کار لانے کا بار پڑنے والا ہے۔

آج سے بیس اکیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ انٹر کالجییٹ مسلم برادرہڈ نے (جنوری ۱۹۳۸ء میں) پہلا یوم اقبال منایا جس میں شرکت کے لئے، ہمارا قافلہ، علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) کے زیر قیادت، دہلی سے یہاں آیا۔ سامنے، لاء کالج کے ہال میں جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس وقت لاہور کے کالجوں کے در و دیوار، اقبال کے پیغام اور جناح کے نام سے گونج رہے تھے اور ایسا نظر آتا تھا کہ یہ نوجوان طالب العلم نہیں، عمل و عقیدہ اور ذوق و شوق کا ایک کارواں ہے جو رقصاں و جنباں اور شاداں و فرحاں، جانب منزل کشاں کشاں جا رہا ہے۔ لیکن تشکیل پاکستان کے بعد رفتہ رفتہ ہوا یہ تھا کہ اقبال کا پیغام اور قائد اعظم کا نام، دونوں نظر انداز ہوتے چلے گئے اور اب ایسے طالب العلم خال خال دکھائی دیں گے جنہیں ان سے کوئی دلبستگی اور پیوستگی باقی رہی ہو۔ ان حالات میں، انہی نوجوان طالب علموں کے ایک گروہ کا آگے بڑھ کر، ایسی تقاریب منانا میرے نزدیک قوم کی نشاۃ ثانیہ کی علامت اور اس کے مستقبل کی درخشندگی کی دلیل ہے۔ میں ان نوجوانوں کو، ان کے اس جذبہ اور عمل پرستحق مبارکباد سمجھتا ہوں۔

قائد اعظمؒ سے میرا تعارف

عزیزانِ من! اوائل ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے، ایک شام مجھے پیغام ملا کہ قائد اعظمؒ تمہیں یاد فرماتے ہیں۔ قائد اعظم اور مجھے یاد فرمائیں!

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

حاضر ہونے پر جو کچھ انھوں نے فرمایا اس کا ملخص یہ تھا کہ پاکستان کی جنگ میں، انگریز اور ہندو نے جو محاذ قائم کر رکھا ہے اس کا مقابلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جو محاذ یہ "قال اللہ اور قال الرسول" کہنے والے مذہب کے نام پر قائم کر رہے ہیں (ان کا مطلب نیشنلسٹ علماء سے تھا) ان کا مقابلہ تمہیں کرنا ہوگا۔

میں ان لوگوں میں سے تھا جو ۱۹۳۰ء کے پاکستانی تھے جب حضرت علامہؒ (اقبال) نے الٰہ آباد کے مشہور خطبہ صدارت میں، پاکستان کا تصور دیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی بہت پہلے کے، جب انھوں نے فرمایا تھا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

میں قرآن کریم کے مطالعہ سے اس حقیقت تک پہنچ چکا تھا کہ اسلام کو دین (نظام زندگی) بننے کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے اور یہی میرے نزدیک پاکستان کی تعریف (DEFINITION) تھی۔ لہٰذا اس سلسلہ میں میرے سپرد جو خدمت کی جا رہی تھی وہ میرا جزو ایمان تھی۔ مجھے اس سے بڑھ کر مسرت اور کس بات سے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد طلوع اسلام کا اجراء ہوا۔ اور پھر تو دس برس تک یہ حالت رہی کہ میں دن بھر ہوم ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا اور شام کو طلوع اسلام (زیب روڈ، قائد اعظم کے ماتحت کردہ) پر ہوتا تھا۔ میں جس قدر ان کے قریب ہوتا گیا میرے دل میں ان کی عظمت بڑھتی گئی۔ اس دوران میں بعض ایسی باتیں بھی سامنے آئیں جن کی یاد آج بھی میرے لئے

وجہ شادابی قلب و نظر ہے۔ لیکن یہ موضوع الگ ہے۔ مجھے اس وقت اس عنوان پر آنا چاہیئے جو میری تقریر کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ یعنی قائداعظم کے نزدیک اسلامک آئیڈیالوجی سے کیا مفہوم تھا اور اسے انھوں نے کس انداز سے پیش کیا۔

بہت بڑی کمی

برادرانِ عزیز! یہ سمجھنے کے لئے کہ قائداعظم کے سامنے معاملہ کیا تھا جب کی دشواریاں کیا تھیں۔ انھوں نے ان تمام دشواریوں پر کس طرح قابو پایا اور پاکستان کا کونسا تخیل اپنوں اور بے گانوں کے سامنے پیش کیا۔ ضروری ہے کہ ہمیں اس دور کا پس منظر معلوم ہو۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ہمارے پاس نہ تو قائداعظم کی کوئی قابل اطمینان "سوانح حیات" ہے اور نہ ہی ہماری اس جنگ آزادی کی کوئی مفصل اور مستند تاریخ۔ آج تو پھر بھی ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جنھوں نے اس جنگ میں خود حصہ لیا یا اس کے مناظر دیکھے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد، جب یہ لوگ اٹھ جائیں گے، تو آنے والی نسلوں کے لئے یہ داستان ایک افسانۂ کہن بن کر رہ جائے گی۔ قوم کے مستقبل کے لئے اس کے ماضی کی سچی اور صحیح تاریخ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

آج عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بالفاظ صحیح یوں کہیئے کہ ایک منظم کوشش کے ماتحت یہ اثر پیدا کیا گیا ہے (اور یہ کوشش ان لوگوں کی طرف سے ہوئی ہے جو اس زمانہ میں نظریۂ پاکستان کے خلاف تھے اور ابھی تک پاکستان میں رہنے کے وجود، وہ دل سے پاکستانی نہیں ہو سکے) کہ اس کشمکش میں مسئلہ زیر نزاع فقط اتنا تھا کہ کانگریس (یعنی ہندو اور قومیت پرست مسلمان) یہ چاہتے تھے کہ سارے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں (سب کی) مخلوط حکومت قائم ہو اور "تفرقہ پسند" (SEPARATIONISTS) — یعنی مسلم لیگ کے حامی — یہ چاہتے تھے کہ ہندوؤں کی الگ حکومت ہو اور مسلمانوں کی الگ۔ اور ان کا یہ مطالبہ انگریزوں کے اشارے پر تھا جو ہندوستان کو آزادی دینا نہیں چاہتے تھے۔

کانگریس کے عزائم

لیکن برادرانِ من! بات اس سے کہیں گہری اور الگ تھی۔ کانگریس کے عزائم کیا تھے؟ اس کا نصب العین کیا تھا؟ وہ ہندوستان میں کیا چاہتی تھی؟ اس کے متعلق مجھ سے نہیں، بلکہ خود کانگریس کے نہایت ذمہ دار حضرات کی زبان سے سنیئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری آچاریہ کرپلانی نے اگست ۱۹۳۹ء میں ایک طویل بیان شائع کیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ کانگریس کے سامنے مقصد کیا ہے۔ میں ان کے اس بیان کا اقتباس آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اسے غور سے سنیئے۔ انھوں نے کہا تھا۔

"وہ لوگ جو کانگریس کے پروگرام کو تو مانتے ہیں لیکن اس سیاسی عقیدہ کو ماننے سے انکار کرتے ہیں جس پر گاندھی جی نے کانگریس کے پروگرام کی بنیاد رکھی ہے وہ درحقیقت نہ تو کانگریس کی حالیہ تاریخی ترقی سے واقف ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی کے فلسفۂ حیات (آئیڈیالوجی) نے کانگریس میں کیا مرتبہ حاصل کر لیا ہے ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اب کانگریس صرف ایک ایسی سیاسی جماعت نہیں جو ملک کو پردیسی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتی ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ بنیاد کو بالکل بدل دینا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد ایک بالکل نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے۔ جب تک کانگریس پر گاندھی جی کا اثر غالب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک کانگریس کے لیڈروں کا خیال تھا کہ ہماری سیاسی غلامی کو ہماری معاشرتی حالت سے براہ راست کوئی بنیادی تعلق نہیں اس لئے ان لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگریس کا یہ کام نہیں کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے۔ وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں یہ ممکن تھا کہ مختلف معاشرتی نظریئے رکھنے والے لوگ سیاسی حیثیت سے ایک محاذ

پر جمع ہو جائیں۔ گویا اُن لوگوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک سیاسی زندگی۔ دوسری معاشرتی زندگی۔ لیکن گاندھی جی نے آکر اس اصول کو توڑ دیا۔ انھوں نے پرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دیکر بتایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم اپنی اخلاقی، روحانی اور معاشرتی زندگی سے جدا کر سکیں۔ اس لئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی اخلاقی اور روحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہی نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دیدیں بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہو اور ہماری زندگی کا ایک بالکل نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا یادگار کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

مہاتما گاندھی کیا تھے

اس اقتباس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کانگریس کا نصب العین، ہندوستان میں ایسے معاشرہ کا قیام تھا جو مہاتما گاندھی کے پیش کردہ فلسفۂ حیات پر مبنی ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "مہاتما گاندھی" کس فلسفۂ حیات کے معتقد تھے اس کی بابت خود ان کی اپنی زبان سے سنئے۔ انھوں نے اپنے متعلق لکھا تھا کہ

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔..... میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔ (بحوالہ خطبہ صدارت، قائداعظم، آل انڈیا مسلم لیگ سیشن۔ دہلی مورخہ ۲۴ء)

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ مہیب خطرہ جس سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے قائداعظم انگلستان میں بود و ماند اختیار کر لینے کے بعد پھر ہندوستان آئے اور میدانِ سیاست میں اترے تھے۔ انھوں نے آکر اعلان کیا کہ مسلمان اپنا جداگانہ تصورِ زندگی۔ جداگانہ فلسفہ حیات۔ جداگانہ کلچر رکھتے ہیں اس لئے وہ اپنے آپ کو کسی اور فلسفۂ حیات میں جذب نہیں ہونے دیں گے۔ انھوں نے مسلم لیگ کے مدراس

قائداعظم کا اعلان

سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبہ صدارت میں فرمایا۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں اس لئے انھیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے گی اسکی سخت مخالفت کی جائے گی۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ ہم اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

انھوں نے (۸ مارچ ۱۹۴۳ء کو) مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ) میں اپنی تقریر کے دوران میں کہا۔

ہندو اور مسلمان خواہ ایک گاؤں یا ایک شہر ہی میں کیوں نہ بستے ہوں وہ کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے وہ ہمیشہ الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں۔

انھوں نے لیگ کے کراچی سیشن میں ان نقاط کو زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا اور صراحت سے بتایا کہ جب ہم کہتے ہیں کہ مسلمان اپنا مخصوص فلسفۂ حیات رکھتے ہیں اور ایک جداگانہ قوم ہیں، تو اس کا مطلب کیا ہے۔ انھوں نے پہلے یہ سوال کیا کہ

وہ کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ایک قطعے میں پرو رکھا ہے وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملی عمارت کی بنیاد ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے ان کی کشتی بندھ رہی ہے؟

اور اس کے بعد خود ہی اس کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

ان سوالوں کا جواب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ یہ محکم رشتہ۔ یہ سنگین چٹان۔ یہ آہنی لنگر خدا کی وہ کتاب عظیم قرآن ہے جس نے تمام مسلمانوں کو جسدِ واحد بنا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں وحدت زیادہ ہوتی جائے گی۔ اس لئے کہ ہمارا خدا ایک خدا کی کتاب ایک۔ اس کا رسول ایک۔ اس لئے ہماری ملت بھی ایک ہے۔

یہ کہہ کر قائداعظم نے (گویا) بھڑوں کے چھتے میں پتھر مار دیا۔ "مہاتما گاندھی" پھنکارتے ہوئے اٹھے اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں فرمایا

میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے۔ کیونکہ میرا قلبی عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز جم ۱۴)

اس پر بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو لکھا کہ

میں ایک تنگ نظر ہندومت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہوتی شروع ہو گئی ہیں لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔ (ہندوستان ٹائمز جم ۱۵)

لیکن قائداعظمؒ پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے — جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

مسٹر گاندھی کے نام

انھوں نے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو مسٹر گاندھی کے نام وہ معرکہ آرا خط لکھا جو تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے یہ خط کافی مفصل ہے اور اس قابل کہ اس کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔ میں اس کا مختصر سا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے اس میں (مسٹر گاندھی کو) لکھا کہ

آپ آج اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے لیکن کل تک جب آپ سے پوچھا جاتا تھا کہ زندگی میں آپ کا نصب العین کیا ہے؟ وہ کونسا جذبہ محرکہ ہے جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لئے آمادہ کرتا ہے؟ کیا وہ سیاست ہے۔ معاشرت ہے یا مذہب ہے تو آپ کا جواب یہ ہوتا تھا کہ وہ مذہب۔ اور خالص مذہب ہے۔ کل تک تو آپ یہ کہتے تھے اور آج آپ مجھ سے یہ فرما رہے ہیں کہ تم مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیٹ لاتے ہو۔ سن لیجئے میرے نزدیک زندگی کا کوئی شعبہ ہو مذہب انسان کے ہر عمل کو اخلاقی بنیاد عطا کرتا ہے۔ اگر مذہب کو بیچ میں نہ لایا جائے تو انسان کی زندگی میں شور و شغب کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے؟

اس پر چاروں طرف سے مخالفت کا سیلاب امڈ آیا۔ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے کہا کہ

نہیں۔ اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر۔ مذہب۔ خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اس نظریہ پر قائم ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہو کر ایک متحدہ قومیت بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۹ جون سنہ ۱۹۴۵ء)

اور تمام ہندو پریس میں چیخ و پکار شروع ہوگئی کہ "مسٹر جناح" پاکستان کا نیا (STUNT) لے کر آگئے ہیں۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے، اپنی مخصوص مسکراہٹ سے فرمایا کہ

"پاکستان کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو صدیوں سے موجود ہے۔ شمال مغربی اور شمال مشرقی ہند مسلمانوں کا حقیقی ملک ہے جہاں آج بھی ستر فی صد سے زیادہ ان کی آبادی ہے۔ ان علاقوں میں ایسی آزاد اسلامی حکومت ہونی چاہیئے جس میں مسلمان اپنے مذہب اپنے کلچر اور اپنے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

آزاد اسلامی حکومت

یہ تقریر انھوں نے دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء میں احمد آباد کے ایک جلسۂ عام میں کی تھی۔ جلسہ میں اقلیت کے صوبوں کے بہت سے مسلمان بھی موجود تھے (خود قائدِ اعظمؒ بھی اقلیت کے صوبہ سے متعلق تھے) آپ نے ان مسلمانوں کو مخاطب کرکے کہا

ہم اقلیت کے صوبہ والوں پر جو گذرتی ہے گذر جانے دو لیکن آؤ ہم اپنے ان بھائیوں کو تو آزاد کرادیں جو اکثریت میں ہیں تاکہ وہ اسلامی قوانین کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کرسکیں۔

قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ کے نصب العین اور پاکستان کے مفہوم کو اس شد و مد سے پیش کیا اور اس اصرار و تکرار سے دہرایا تھا کہ کسی کو اس کے متعلق کوئی مغالطہ نہیں رہا تھا۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ یہ تجویز زیرِ غور تھی کہ کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں قائم کرے۔ اس پر مسٹر ستیہ مورتی نے کہا تھا کہ

کانگریس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت کس طرح بنا سکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۱ جون)

قرآنی حکومت

سنہ ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں "اکھنڈ ہندوستان کانفرنس" منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا۔

تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ انہیں معلوم تو سن لیجئے۔ نظریہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک

---

[1] واضح رہے کہ تقریر میں ان اقتباسات کو ربطِ مضمون کے لئے سی تسلسل سے پیش کیا گیا تھا۔ نہ کہ ان بیانات کی تاریخی ترتیب کی رو سے۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ اُس زمانے میں کانگریسیوں کے خیالات کیا تھے۔ اور قائدِ اعظمؒ ان کا کیا جواب دیتے تھے؟

کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو۔ اس کے برعکس تم جانتے ہو کہ اکھنڈ ہندوستان کے سامنے کیا مقصد ہے؟ اس کا مقصد وہ عظیم الشان کلچر ہے جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے۔ وہ کلچر جو زمانۂ قبل از تاریخ میں پیدا ہوا۔ اور چھ ہزار سال کی مدت مدید میں بڑھتا۔ پھولتا۔ پھلتا۔ زمانہ کی سطح کو یوں روندتا ہوا آگے بڑھتا گیا جس طرح مادر گنگا طوفان کے وقت امنڈتی چلی جا رہی ہو۔

(ٹریبون ۱۱/۴ ۲)

خطبے کے آخر میں مسٹر منشی نے مسلمان قومیت پرستوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے مسلم عوام تک پہونچ کر انھیں اس نظریۂ افتراق (پاکستان) کے خطرات سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟ جلسہ میں جمیعۃ العلماء کے ایک رکن تشریف فرما تھے انھوں نے ابھر کر کہا کہ ہم نظریۂ پاکستان کی مخالفت کریں گے۔ کیونکہ یہ نظریہ اسلام کے خلاف ہے! (بحوالہ ہندوستان ٹائمز)

پاکستان کے مخالف

آپ کو آج اس پر یقیناً حیرت ہوتی ہوگی کہ وہ کونسا مسلمان ہو سکتا تھا جو اس نظریہ کو خلافِ اسلام قرار دے کہ مسلمان ایک آزاد خطہ میں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں زندگی قرآن کریم کے اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ لیکن اس نظریہ کی مخالفت ہوتی تھی اور سخت مخالفت ہوتی تھی! یہ مخالفت کرنے والے کون تھے؟ جمیعۃ العلماء ہند جس کے سرغنہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مفتی کفایت اللہ۔ مولانا احمد سعید وغیرہم "علمائے کرام" تھے۔ بہار میں اس کے مخالف' الضار۔ پنجاب میں مجلسِ احرار اور جماعتِ اسلامی۔ سرحد میں سرخپوش یہ سب اس مطالبہ کے خلاف تھے کہ مسلمان اپنی آزاد حکومت قائم کریں جس میں طرزِ زندگی اسلامی قالب میں ڈھل جائے۔ یا للعجب!

ہم نے پہلے کہا ہے کہ ہندو اچھی طرح سے جانتا تھا کہ نظریۂ پاکستان سے مفہوم کیا ہے اور جداگانہ قومیت کی بنیاد کس اصول پر ہے۔ جب قائدِ اعظمؒ نے (۱۹۳۹ء میں) اپنا پیغام عید نشر کیا جس میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے تصور کی وضاحت کی' تو مہاتما گاندھی" کے پرائیویٹ سکریٹری' مسٹر مہادیو ڈیسائی نے' اخبار ہریجن میں ایک مقالہ لکھا جس میں اس نے کہا کہ

ایک جداگانہ قومیت کا تخیل ہی اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے۔

(ہریجن ۱۱/۹ ۲۵)

قائدِ اعظمؒ نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور دے کر اس حقیقت کا اعلان کیا کہ اس میں شک کیا ہے کہ اسلام کا مقابلہ کوئی دوسرا مذہب نہیں کر سکتا۔ لیکن' ادھر سے مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا کہ یہ غلط ہے۔

مولانا آزاد کی تفسیر

عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ قرآن نے نوعِ انسان کے سامنے مذہب کی عالمگیر سچائی کا یہ اصول پیش کیا ہے کہ تمام مذاہب سچے ہیں[ل]۔ لیکن پیروانِ مذاہب سچائی

ل قرآن نے کہاں ایسا کہا ہے؟

سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائیوں کو از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا مقصد پورا ہو گیا۔

(ترجمان القرآن۔ جلد اول۔ تفسیر سورۂ فاتحہ)

اس طرح انھوں نے "مہاتما گاندھی کے اس فلسفہ کی "قرآنی" سند بہم پہنچا دی کہ قرآن اور گیتا کا خدا ایک ہے۔ اس لئے اسلام کو ہندو مت پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ انہی "مہاتما جی" کا فلسفہ تھا جن کے "جسم کا رواں رواں ہندو تھا"۔ لیکن جناب آزاد نے جن کے متعلق اپنے رام گڑھ کے کانگریس کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی بنظرت کا ایک روشن پہلو ہے جو مہاتما گاندھی کی "روحِ عظیم" کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔

اللہ اکبر! وہ شخص جو اپنے آپ کو فخر سے بُت پرست کہتا ہے اسے "روحِ عظیم" کا حامل بتایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ تھا ہندو کے پاس "جہاد" کے مطالبۂ اسلامی حکومت کا توڑ۔ انھوں نے مولانا آزاد کی اس تفسیر کا ہندی زبان میں ترجمہ کرا کر اس کی عام اشاعت کی۔ دوسری طرف "وارد ھا کی تعلیمی اسکیم" کے ذریعے (جسے پھر بدقسمتی سے ایک مسلمان ــــ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی طرف منسوب کر کے شائع کیا گیا تھا) اس نظریہ کو بچوں کے نصاب میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی۔

یہ کچھ برادرانِ عزیز! مذہب کے علمبرداروں کی طرف سے، جُبّوں اور قبّوں، عماموں اور دستاروں سے مرصع ہو کر کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف ایک ہیٹ اور سوٹ پوش "مسٹر" تھا ــــ جس کے متعلق جماعتِ اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بڑے طنز اور تحقیر سے کہتے رہتے تھے کہ ان کی ذہنیت مغربی تعلیم و تربیت کی تخلیق ہے اور

ان کے خیالات۔ نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں غور و بین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔

(سیاسی کشمکش مطبوعہ ترجمان القرآن جلد ۱۵ عدد ۶ صـ ۶۶)

دعوت الی القرآن

وہ کاروانِ ملت کو برابر قرآن کی طرف دعوت دیئے چلا جاتا تھا۔ اس نے سنہ ۱۹۴۵ء میں اپنے عید کے پیغام میں قوم سے کہا کہ

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے احکام صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحر اطلانطک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات سے نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسانی کے تمام اعمال و اموال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے۔ یہ ضابطہ حیات، مذہب، معاشرت۔ تجارت۔ عدالت۔ فوج۔ پولیس۔ فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لیے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا سوال ہو یا انفرادی حقوق کا۔ اخلاقیات

کا معاملہ ہو یا جرائم کا۔ اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

اس پر یقیناً ہر شخص کو تعجب ہوگا کہ جس شخص کے خیالات میں "خود دین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہ دیکھی جاسکتی تھی" اس نے دین کے ان غوامض کو کہاں سے حاصل کر لیا؟

سر خدا کہ زاہد و عابد بکس نگفت در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید

اس کا جواب، اقبال کے ان الفاظ کے علاوہ اور کیا دیا جاسکتا ہے کہ

خرد نے اس کو عطا کی نظر حکیمانہ سکھائی عشق نے اسکو حدیثِ رندانہ

اس نے اپنی خداداد بصیرت سے، خالی الذہن ہو کر، خدا کی کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔ اور اس کتابِ عظیم نے اپنے یہ حقائق اس پر داشگاف کر دیئے تھے۔

برادرانِ عزیز! وقت تیزی سے دوڑ رہا ہے اور یہ داستان ابھی طویل ہے۔ لیکن میں اسے ایک اقتباس پر ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ اگست ۱۹۴۶ء میں قائداعظمؒ حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں چند نوجوانوں نے آپ سے انٹرویو لیا اور کچھ سوالات پوچھے۔ یہ سوال و جواب، اورینٹ پریس کی وساطت سے باہر آئے۔ آپ انھیں سنئے اور پھر غور کیجئے کہ کس اختصار اور جامعیت سے اسلامی حکومت کے خصائص اور لوازم کو اس "رہبرِ فرزانہ" نے بیان کیا ہے۔ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ غور سے سنئے۔

اسلامی حکومت کے خصائص

سوال۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریقِ کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب۔ اشتراکیت۔ بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک۔ دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی

سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال۔ ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ تو ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصہ میں جو کچھ قائد اعظمؒ نے کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ پر بار بار غور کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ جواب ان تمام پیچیدگیوں کو صاف کر دیتا ہے جو اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق آجکل عام طور پر ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے جواب میں فرمایا۔

جواب۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز تو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

برادرانِ عزیز! ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ

(۱) اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

(۲) اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی اور شخص کی نہ ادارہ کی۔

(۳) قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں

(۴) اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

فرمایئے! کیا اسلامی حکومت کے اصول و معانی کے متعلق اس سے زیادہ صاف، واضح اور جامع بات کچھ اور بھی کی جا سکتی ہے؟

یہ تھی برادرانِ عزیز! وہ اسلامک آئیڈیالوجی جسے قائد اعظم محمد علی جناحؒ پیش کرتے تھے اور وہ تھے حالات جن میں انہوں نے اس آئیڈیالوجی کو پیش کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ میری ان مختصر سی معروضات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ہماری جنگِ آزادی سے مفہوم کیا تھا۔ وہ کونسا خطرہ تھا جس سے ملت کو بچانے کے لئے، قوم کا یہ مشفق و غمخوار، دوبارہ میدانِ سیاست میں آیا تھا۔ ہندوؤں کے مشوموم عزائم کیا تھے اور ان کے ہمنوا مسلمان افراد اور جماعتیں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کیا کرنا چاہتی تھیں! اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ پاکستان کی سرزمین حاصل کرنے سے حقیقی مقصود کیا تھا؟

اس کے بعد یہ ہماری انتہائی بدقسمتی تھی کہ اس خطۂ زمین کے حاصل ہونے کے ساتھ ہی، یہ کاروانِ سالارِ ہم میں باقی نہ رہا۔ اور اس کے بعد ــــ اس کے بعد

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹/۵۹)

اس کے بعد ایک طرف ایسے ناخلف پیدا ہو گئے جنھوں نے زندگی کے بلند مقاصد کو فراموش کر دیا۔ اعلیٰ اقدار کو ضائع کر دیا۔ اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کے اٹل قانونِ مکافات کے مطابق، تباہیاں ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔ دوسری طرف، وہی عناصر جو آخری وقت پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، نہایت ڈھٹائی سے پاکستان ہو گئے اور بڑے بڑے مقدس اور معصوم نقابوں میں، اس آتشِ انتقام کے فرو کرنے میں مصروف ہو گئے جو قائدِ اعظم کے ہاتھوں شکستِ عظیم سے ان کے دلوں میں بھڑک اٹھی تھی۔ ان سب حالات نے مل کر ہمیں اس مقام تک پہنچا دیا جس سے ہر شخص باخبر ہے۔

لیکن اس سے برادرانِ عزیز! مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب انھوں نے کہا تھا کہ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی ہر چیز بنتی اور بگڑتی۔ بگڑتی اور بنتی ہے۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر کارِ جہاں بے ثبات۔ کارِ جہاں بے ثبات

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

یہی وہ "مردِ خدا" ہے جس کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ وہ یاد کہ جس سے ایک طرف ہر صاحبِ نظر کی یہ کیفیت ہو کہ

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال

اور دوسری طرف ہر قلبِ حساس کا یہ عالم ہے کہ

فرشتے پونچھ لیتے ہیں مرے رخسار سے آنسو
الٰہی! آج کس کی یاد میں شبنم فشاں ہوں میں

والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

ضرورتِ رشتہ

ایک متوسط گھرانے اور شریف خاندان کی لڑکی کے لئے موزوں رشتہ کی ضرورت ہے۔ لڑکی کی عمر قریب اٹھارہ سال۔ تعلیم متوسط۔ سلیقہ شعار۔ گھر کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل

ضرورت مند احباب اپنے تفصیلی حالات لکھ کر حسب ذیل پتہ خط و کتابت کریں۔

خ۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

ضرورتِ رشتہ

ایک شریف خاندان بی۔ اے تک تعلیم یافتہ کنوارے ۱۳ مربع زرعی اراضی کے مالک نوجوان زمیندار کے لئے تعلیم یافتہ امورِ خانہ داری سے واقف۔ قبول صورت اور تربیت یافتہ رشتہ کی ضرورت ہے۔ پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں۔

ایم۔ معرفت شیخ سلطان احمد صاحب وکیل۔ جھنگ۔ صدر

حقائق و عبر

۱۔ رویت ہلال کمیٹیاں

حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ رویت ہلال کمیٹیوں کو توڑ دیا جائے اور آئندہ کے لئے مسلمانوں کے مختلف تہواروں کی تاریخیں حکومت خود متعین کیا کرے۔ یوں تو یہ فیصلہ ہر لحاظ سے مستحق صد تبریک و تہنیت ہے لیکن جس نقطۂ نگاہ سے ہم اسکی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں وہ ایک اصولی بات ہے۔ قرآن کے طالب العلم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ مذہبی پیشوائیت کا وجود "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"۔ اسلام میں یہ پودا غیر مسلم زمینوں سے آیا اور اُس وقت لایا گیا جب ہمارے ہاں ملوکیت نے دین اور دنیا کی ثنویت (DUALISM) کا بُت نصب کیا۔ سرزمین پاکستان اس اعتبار سے بڑی خوش بخت ہے کہ اس میں ملوکیت کا یہ بت پہلے دن ہی سے نہیں آیا۔ اب اگر اس کا آئندہ دستور قرآنی خطوط پر متشکل ہو گیا تو اسے عصرِ حاضر کی سب سے پہلی اسلامی مملکت ہونے کا شرفِ عظیم بھی حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے ہی یہاں بعض ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں جن کا رخ صحیح اسلامی منزل کی طرف ہے۔ مثلاً زرعی اصلاحات۔ حکومت کا موجودہ فیصلہ جس کی رُو سے مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ تقدس اقتدار کی کم از کم ایک شاخ کم ہو جائے گی اسی قبیل سے ہے۔ یاد رکھیئے۔ سرمایہ داری۔ جاگیرداری۔ زمینداری۔ مذہبی پیشوائیت کا یہ سب شجر اسلام پر اکاس بیل کی طرح ہے۔ جس حد تک اس بیل کو الگ کیا جائے گا اسی حد تک یہ شجرِ طیب سرسبز و شاداب رہے گا۔ لہٰذا ہر وہ کوشش جو اس اکاس بیل کو ختم کرنے کے لئے کی جائے مستحق مبارکباد اور اسلام کی بارگاہ میں درخورِ تحسین ہے۔ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں "مولوی" کا کہیں وجود نہیں تھا۔ اُس زمانے کے لٹریچر میں یہ لفظ ہی نہیں ملتا۔ اس لئے جو معاشرہ اُس دورِ ہمایوں کے نقشِ قدم پر متشکل ہوگا اس میں بھی اس "بدعت" کا وجود نہیں ہوگا۔

لیکن مولوی صاحبان کے حلقہ میں حکومت کے اس فیصلہ سے سراسیمگی شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ ۱۱ دسمبر ۵۹ء کے الاعتصام (لاہور) میں ایک "فتویٰ" شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حکومت نے اپنے فیصلہ کی تائید میں جو یہ دلیل دی ہے کہ اس سے اختلاف مٹ جائیگا تو یہ کوئی وزنی دلیل نہیں۔ اس لئے کہ

> عیدین کا مختلف شہروں کے اعتبار سے متعدد ہونا کوئی قبیح نہیں۔ کیونکہ عیدین میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی۔ جن میں تمام شہریوں کا اتحاد ضروری ہو۔ سال میں عیدین صرف دو دفعہ ہی ہوتی ہیں۔ اس سے

کون سی الجھن پڑ جاتی ہے؟

کس قدر خوبصورت انداز میں کہہ گیا ہے غالب کہ

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"
بجا کہتے ہو! سچ کہتے ہو! پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو؟

جن لوگوں نے اس قسم کی وضعی حدیثیں نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر رکھی ہوں کہ "اختلاف امتی رحمۃ" (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) وہ اگر اختلاف میں کوئی قباحت نہ دیکھیں تو کون سی اچنبھے کی بات ہے؟

اس کے بعد ارشاد ہے۔

پھر ایک شہر میں متعدد عیدوں کی وجہ سے اگر فرقہ وارانہ اختلاف رونما ہو تو یہ کوئی نئی چیز نہیں۔

اور چونکہ یہ کوئی نئی چیز نہیں، اس لئے اس کا مٹانا بھی ضروری نہیں!

اگر ایک دن میں ہی عید ہو تب بھی یہ اختلاف موجود رہے گا۔ جب تک یہ تمام فرقے ایک فرقے میں تبدیل نہیں ہو جاتے اس وقت تک صرف ایک دن عید کی نماز پڑھ لینے سے یہ اختلاف مٹ نہیں سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ جب تک فرقے نہیں بنتے، اختلاف بالکلیہ نہیں مٹ نہیں سکتا۔ (بلکہ یوں کہیئے کہ اسلام اس وقت تک اپنی اصلی شکل میں رونما نہیں ہو سکتا) لیکن مولوی صاحب کے نزدیک فرقے مٹانے کا طریق یہ ہے کہ یہ سب فرقے اس فرقے میں تبدیل ہو جائیں جس فرقے سے یہ مولوی صاحب خود وابستہ ہیں۔ لیکن خلافت علیٰ منہاج نبوت میں فرقے مٹانے کا طریق یہ ہوگا کہ کوئی فرقہ باقی نہ رہے۔ صرف مسلمان باقی رہیں۔ اور یہی چیز مولوی صاحبان پر گراں گذرتی ہے۔

معاصر الاعتصام نے اس "فتویٰ" کے آخر میں لکھا ہے کہ "اسے اس بارے میں حرفِ آخر نہ سمجھا جائے مزید تحقیق کے لئے ہماری طرف سے غور و فکر کی دعوت ہے"۔

ہم انتظار کریں گے کہ ان حضرات کی مزید تحقیق کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اگرچہ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

۲۔ اختلاف کی رحمتیں!

ہفتہ وار "صدق" (لکھنؤ) کی ۲۷ نومبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں ایک شذرہ شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء (متوفی ۱۹۲۳ء) ایک مستند صاحب علم و صاحب قلم گذرے ہیں۔ انیسویں صدی کے آخری دہے میں ایک لمبا سفر دہلی، سہارنپور، دیوبند وغیرہ کا کیا اور اپنا سفرنامہ روزنامچہ کی شکل میں مرتب کر کے اس کا نام "ارمغانِ احباب" رکھا۔ حال میں یہ کتاب ان کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن

علی ندوی کے زیر اہتمام دہلی اور اس کے اطراف "مکتبہ دار العلوم ندوۃ لکھنؤ" سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے صفحہ ۶۰ پر ایک لمبا قصہ درج ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دہلی کے ایک شخص نے ایک اہلحدیث عالم کے پاس آکر کہا۔ "اس محلے میں ایک عورت سے مجھ کو کمال درجہ کی الفت ہے۔ لیکن اس کے خاوند موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کوئی ایسی تدبیر ہو کہ وہ میرے قابو میں آجائے اور شریعت میں بھی جائز ہو۔ انھوں نے کہا کہ یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے۔ یہ لوگ یعنی حنفی المذہب مستحل الدم ہیں۔ ان کا مال مالِ غنیمت ہے۔ ان کی بیویاں ہمارے واسطے جائز ہیں۔ آپ قابو میں لاسکتے ہوں تو شوق سے لائیے۔ انھوں نے کہا کہ بس مجھ کو یہی چاہیئے تھا۔ اور وہاں سے چلے گئے"۔ اور یہ تیغ زنی تنہا اہلِ حدیث کی طرف سے نہ تھی۔ اسی عہد کے یعنی آج سے ساٹھ، ستر سال قبل کے مذہبی لٹریچر کو کھنگالئے، تو ایسے ہی زہر میں بجھے ہوئے فقرے حنفی عالموں کے قلم سے اہل حدیث (یا علماء ہی کی زبان میں "غیر مقلدین") کے حق میں بھی نکلیں گے! دونوں فریق کلمہ گو، اور اہلِ قبلہ ہی نہیں۔ بلکہ دونوں اہلِ سنت کے اندر۔ اور اس پر بھی تعصب کا یہ جوش و خروش کہ ان کے نزدیک وہ کشتنی۔ اور اُن کے نزدیک یہ گردن زدنی!

یہ ساٹھ۔ ستر سال پہلے ہی کی بات نہیں۔ آج بھی فرقوں کا باہمی سر پھٹول اسی طرح جاری ہے اور جاری رہے گا جب تک فرقے مٹ کر صرف مسلمان باقی نہیں رہ جاتے۔ قرآن کی رُو سے فرقوں کا وجود شرک ہے۔

۳۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے

جماعت اہلِ حدیث کے ترجمان "الاعتصام" (لاہور) کی ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں "اسلام میں عورت کا درجہ" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں قرآنِ کریم کی متعدد آیات درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

> اِن آیاتِ مبارکات سے واضح ہو گیا کہ اسلام میں مرد اور عورت کا درجہ ایک ہے۔ وہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کریں گے تو بہتر درجہ پائیں گے اور اگر نافرمانی اور سرکشی و تمرد کا اظہار کریں گے تو مستوجب سزا ٹھہریں گے۔
>
> مرد کو اسلام میں محض اس بنا پر کوئی فضیلت و اہمیت حاصل نہیں کہ وہ مرد ہے اور عورت محض اس بنا پر راندۂ درگاہ نہیں کہ وہ عورت ہے بلکہ نیکی اور بدی اور اس کی جزا و سزا میں دونوں کا درجہ ایک ہے اور دونوں کے اعمال و افعال قابلِ مواخذہ بھی ہو سکتے ہیں اور لائقِ مغفرت و غفران بھی۔
>
> اسی طرح حدیث میں عورتوں کے حقوق و واجبات کی خاص تلقین کی گئی ہے اور تاکید فرمائی گئی ہے کہ ان کے حقوق پہچانو اور ان کو ہر حال میں بجا لاؤ۔ اسی لئے اسلام کے ہر عہد اور ہر دور میں عورتوں نے علوم و فنون میں ترقی کی، اور ان میں سے بعض اپنی ذہانت و قابلیت کی بنا پر مردوں سے بھی بازی لے گئیں اور

ان کے کارنامے تاریخِ اسلامی کا ایک مستقل حصّہ ہیں۔

للہ الحمد کہ ان حضرات کی طرف سے بھی یہ کچھ سننے میں آیا، ورنہ یہ تو یہی کہتے چلے آ رہے تھے کہ مرد، عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں۔ عورت ناقص العقل ہے۔ پسلی کی ہڈی سے پیدا کی گئی ہے جو ہمیشہ ٹیڑھی رہتی ہے۔ اسے دھڑا دھڑ پیٹنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

طلوعِ اسلام اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے کہ اس کی طرف سے پیش کردہ دعوت الی القرآن رفتہ رفتہ رنگ لا رہی ہے۔ اس نے انہی حضرات سے گالیاں سنیں۔ کچوکے سہے۔ نشتر برداشت کئے۔ ہزار پریشانیاں اٹھائیں۔ لیکن بالآخر اس کی آواز کا اثر ہو کر رہا۔ یہ اس کی سعی و کاوش کا کافی صلہ ہے۔

۴۔ اب فرمایئے؟

(سابق) جماعتِ اسلامی، تحریکِ پاکستان کی سخت مخالف تھی۔ اس کی تبلیغ یہ تھی کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہ کر اسلام پھیلانا چاہیئے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ اس دورِ جمہوریت میں اکثریت اور اقلیت کا سوال بڑا بنیادی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اپنی جداگانہ مملکت قائم نہ کی تو انھیں ہندوستان میں مستقل اقلیت بن کر رہنا اور اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنا ہوگا۔ اس جماعت کے امیر اس خیال کو فرنگی سیاست کی پیداوار کہہ کر اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کی طرف سے حال ہی میں ایک رسالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔ "ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ" اس رسالہ پر صدق (لکھنؤ) کی ۲۰ر اکتوبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس میں اس رسالہ کا حسبِ ذیل اقتباس قابلِ غور ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ

> موجودہ سیاست سے کنارہ کش ہو جایئے۔ یہ سراسر غیر اسلامی ہے۔ اس سے اسلام نہیں، غیر اسلام قائم ہوتا ہے۔ نیز انسان، خلاقی کردار کھوئے بغیر اس راہ میں کچھ نہیں پا سکتا۔ آپ اگر متحد ہو کر بھی سیاست کے میدان میں داخل ہوں تو بھی آپ کا عددی تناسب ایک اور دس کا رہے گا۔ اور جمہوریت میں ایک کو دس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ملتا بالخصوص جبکہ دس کا ایک کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ ہو۔

فرمایئے! اگر پاکستان کے مسلمان بھی متحدہ ہندوستان میں رہتے۔ تو ان کا حشر بھی یہی نہ ہوتا؟ جمہوریت میں جو نتیجہ ایک اور دس کے تناسب کا ہوتا ہے وہی ایک اور چار کی نسبت کا ہوتا ہے۔

کس قدر خوش بختی تھی ہندوستان کے مسلمانوں کی کہ وہ اُس وقت ان "ناصحینِ مشفق" کی باتوں میں نہ آگئے اور "فرنگی زادہ" جناح (علیہ الرحمۃ) کی دعوت کی تائید کر کے اپنی آزاد مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۵۔ آپ انھیں پہچانتے ہیں

ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔

> یہ تمام فتنے، اس لئے نہیں پیدا ہو رہے ہیں کہ خدانخواستہ خود اسلام کی تعلیمات

میں کوئی ایسی چیز ہے جو ان کے لئے راہ کھول رہی ہے۔ اسلام اللہ کا آخری اور کامل دین ہے۔ اس میں اس قسم کے فتنوں کے لئے کوئی رخنہ موجود ہونا کس طرح ممکن ہے؟ جو چیز ان فتنوں کی راہ کھولتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غلط مقصد حاصل کرنے کے لئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح بات کی ایک کمزور تاویل اختیار کی جاتی ہے اور پھر اس کمزور تاویل کو بنیاد بنا کر اس پر ایک نہایت فتنہ انگیز اصول وضع کر دیا جاتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر یہ فرمایا ہے کہ خلفاء قریش میں سے ہوں گے تو آپ کے اس ارشاد کی مختلف تاویلیں ممکن ہیں اور لوگوں نے جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، اس کی مختلف تاویلیں کی بھی ہیں لیکن ایک شخص یہ کرتا ہے کہ ان تاویلوں میں سے ایک تاویل وہ یہ اختیار کر لیتا ہے کہ حضورؐ نے قریش کو خلافت کے معاملہ میں دوسروں پر یہ ترجیح ان کی قرشیت کی بنا پر دی اور پھر اس پر غضب یہ کرتا ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے اس حکم کے ذریعہ سے اسلام کے اصولِ مساوات کو توڑا۔ پھر غضب پر غضب اور ستم بالائے ستم یہ کرتا ہے کہ اپنے اس مفروضہ پر ایک نیا اصول وہ یہ وضع کر دیتا ہے کہ چونکہ حضورؐ نے حکمت عملی کے تحت اسلام کے ایک اصول کو توڑا اس وجہ سے کسی دوسرے کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکمت عملی کے تقاضوں کے تحت اسلام کے کسی اصول کو (توحید و رسالت کے سوا) توڑ سکے۔

(میثاق۔ نومبر ۱۹۵۹ء۔ ص ۳۶)

اسی کے تسلسل میں یہ بھی۔

یہ ہمارے بزرگوں کی طرف سے اسلام کے اس دستور اور اس نظام کی تعبیر ہو رہی ہے جس کے قیام کا مطالبہ یہ حضرات اس بیسویں صدی میں لے کر اٹھے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نظریہ کے ساتھ ساتھ اسلامی مساوات کی تعریف و توصیف سے بھی زبانیں خشک ہوئی جا رہی ہیں .... اللہ کے ان نیک بندوں سے کوئی پوچھے کہ یہی اس خلافتِ راشدہ کا تصور ہے جس کا جلوہ دنیا کو دوبارہ دکھانے کے لئے آپ حضرات اٹھے تھے اور جس کے غلغلے سے آج سولہ، سترہ سال سے لوگوں پر خواب و خور حرام ہو رہا تھا۔ اسلام کی یہی وہ جمہوریت ہے جس کے آگے آپ حضرات دنیا کی تمام جمہوریتوں کو مستحق نفرت و لعنت قرار دیتے ہیں۔ (میثاق دسمبر ص)

اس کے لکھنے والے ہیں امین احسن صاحب اصلاحی۔ اور جن کے متعلق یہ لکھا گیا ہے وہ ہیں سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔ یہ وہی مودودی صاحب ہیں جنہیں اصلاحی صاحب "مزاج شناسِ رسول" مانتے تھے ــــ اور یہ کوئی ایک آدھ دن کی بات نہ تھی۔ اصلاحی صاحب ان تمام سولہ، سترہ سال میں مودودی صاحب کے نظریۂ دین کے پُرجوش حامی اور مبلغ۔ اس کا "غلغلہ بلند کرنے" میں ان کے نفیرِ نیا کرتے رہے ہیں آج یہ کچھ انہی مودودی صاحب کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ انسان جب بھی خدا کی کتاب کو چھوڑ کر اشخاص کا اتباع اختیار کر لیتا ہے تو اس کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ عروۃ الوثقیٰ صرف خدا کا عطا کردہ ضابطۂ حیات ہے۔ باقی ہمہ آذری۔